بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصلِ دیں آمد کلام اللہ معظّم داشتن
پس حدیثِ مصطفےٰ بر جاں مسلّم داشتن

اہلحدیث کا مذہب

از افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری

ناشر

ادارہ اشاعۃ السنۃ

جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان حدیث منزل ۲ ایبک روڈ لاہور

طابع	محمد سلیمان انصاری
ناشر	ادارہ اشاعۃ السنہ
مطبوعہ	کیمبرج پرنٹنگ پریس لاہور
تاریخ اشاعت	یکم اپریل ۱۹۷۰ء

فہرست مضامین

اعیانِ اہلحدیث کی خدمت میں اپیل

(قدرے مناسب ترمیم کے ساتھ حضرت مصنّف مرحوم ہی کے لفظوں میں)

آج تک جماعت اہلحدیث نے جو کچھ ترقی خدا کے فضل سے کی ہے آپ صاحبوں پر مخفی نہیں باوجودیکہ ان کے خلاف ہر طرح سے کوششیں ہوئیں مگر پھر بھی ان کی تحریک جو بجلی کی طرح تمام ملک میں پھیل گئی اور پھیل رہی ہے، اس کا ظاہری سبب یہی سلسلۂ تحریر و تقریر ہے اور کچھ نہیں پس آپ صاحبان اس رسالہ کو مفید پائیں تو آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی اشاعت میں ادارہ اشاعۃ السنّۃ کا ہاتھ بٹائیں، مرکزی جمعیۃ اہلحدیث نے محض اس غرض سے کہ یہ رسالہ مسلمانوں میں عموماً و خصوصاً شائع ہو، اس ہوش ربا گرانی کے دور میں بڑی محنت و صرفِ زرِ کثیر کے بعد اس کو شائع کرایا ہے۔"

جن حضرات کی دلی آرزو ہے کہ مسلمانوں میں توحید و سنّت کا رواج ہو تو جہ اس رسالہ کو حسبِ حیثیت خرید کر مفت تقسیم کرائیں گے اور خداوندکریم سے اجرِ عظیم پائیں گے، علماءِ کرام سے بالخصوص توقع ہے کہ اس کام میں توجّہ سے اہلِ دل اصحاب کو ترغیب دلا کر الدال علی الخیر کفاعلہ سے حصہ لیں گے۔

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

ناظم نشر و اشاعت مرکزی جمعیۃ اہلحدیث مغربی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی النبی واٰلہٖ

دیباچہ

التماسِ مصنّف

ہندوستان میں جب سے گورنمنٹ کے آزادی دینے سے تصنیف کا چرچا ہوا ہے۔ مذہبی تصنیفات نے مختلف رنگ اختیار کیے ہیں۔ بعض اہل علم نے تو اس نعمت کی قدر کی اور اپنے خیالات کی اشاعت مناسب الفاظ اور عبارات میں کر کے ملک کو فائدہ پہنچایا۔ مگر اکثر تو ایسا ہوا کہ ایک فریق نے دوسرے فریق پر بیجا تہمتیں لگائیں۔ دل دکھائے، سب وشتم سے کام لیا، گویا اس نعمتِ خداداد (آزادی) کو کفرانِ نعمت سے تبدیل کیا۔ جو کسی طرح (عقلاً ونقلاً) اُن کو جائز نہ تھا۔ اس سے بعد ندوۃ العلماء[1] کا دور آیا، تو گو ندوہ کی منصفانہ تحریک نے بہت سے نیک دلوں کو اپنی طرف مائل کیا،

[1] : ندوۃ العلما ایک مجلس ہے جس میں علماء ومشائخ جمع ہو کر مسلمانوں کو اتفاق اور محبت میں ترقی کرنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ ہر سال اس مجلس کے جلسے مختلف شہروں میں ہوا کرتے ہیں۔ (منہ)

اور انہوں نے باہمی نزاع کو (جس سے حد تک متجاوز ہو کر مسلمانوں کو فرمانِ خداوندی یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ کا مخاطب بنا دیا تھا) اپنی حد پر لانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ندوہ نے سالانہ رپورٹ سال دوم کے صفحہ ۹ پر صاف لکھ دیا کہ "اہلِ حدیث[1] اور حنفیہ کا اختلاف دراصل وہی اختلاف ہے جو ابتدا سے حنفیہ اور شافعیہ وغیرہ میں چلا آتا ہے جسے ناحق رائی سے پہاڑ بنا یا گیا۔"

باوجود ان سب کوششوں اور تحریکوں کے بعض اطراف میں ہنوز روزِ اوّل ہے۔ مسلمانوں کا باہمی اختلاف اس قدر مضر نہیں جس قدر ایک دوسرے سے منافرت مضر ہے۔ منافرت کا منشا دراصل بسا اوقات ایک فریق کی دوسرے کے مذہب سے ناواقفی اور ناواقفی میں افترا پردازی ہوتا ہے۔ فرقہ اہلحدیث کی نسبت کئی ایک من گھڑت افترا لگائے گئے ہیں اور لگائے جاتے ہیں۔ بڑا افترا جس نے اس فرقہ کو سب کی نظروں میں حقیر اور مطعون کر رکھا ہے (اور واقعی وہ افترا درصورت ثابت ہونے کے اسی ذلت اور حقارت کو مستلزم ہے) یہ ہے کہ اس جماعت کے لوگ انبیاء اور اولیاء کی توہین کرتے ہیں بلکہ اس توہین

---

[1]: ندوہ کی رپورٹ میں "غیر مقلد" کا لفظ ہے مگر اصل نام وہی ہے جو کوئی قوم یا شخص اپنے لیے آپ تجویز کرے۔ پس جس طرح زید کا نام خالد اور عبداللہ کو عبدالرحمٰن کہنا صحیح نہیں اسی طرح اہلحدیث کو غیر مقلد یا وہابی کہنا غلط ہے (منہ)

کرنے کو اپنا دینی شعار[1] جانتے ہیں۔ بزرگوں سے منکر ہیں۔ اولیاء اللہ کی کرامات سے انکاری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے منکر، درود نہیں پڑھتے، پھوپھی سے نکاح جائز بتلاتے ہیں، سؤر[2] کی چربی کو حلال کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑے بھائی جتنا ادب جانتے ہیں (یہ افترا توہین انبیاء والے افترا سے صریح متناقض ہے فافهم) وغیرہ وغیرہ۔

یہ افترایات ایسے کچھ زبان زد ہوئے ہیں کہ عام تو عام خواص بھی یہ سن کر اہلحدیث سے بدگمان ہو جاتے ہیں، انہیں افتراؤں سے عالی جناب حضرت امیر[3] عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم والی سلطنت افغانستان جیسے

---

[1]: دیکھو رسالہ جوهد الایقان مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۔ اسی رسالہ سے کبیدہ خاطر ہو کر میرے ایک دوست منشی محمد غوث الدین صبیغہ دار عدالت دا اور ضلع شعلہ پور (بمبئی) نے رسالہ ہذا کے لکھنے کی تحریک کی تھی۔ (منہ)

[2]: رسالہ رحمۃ للعالمین صفحہ ۳۶۔ مطبوعہ چشمہ نور پریس امرتسر (منہ)

[3]: آنچہ بذریعہ اخبارات انگریزی و اردو و دیگر تصنیفات ہمچوں قسم کہ در آنہا ذکر و ترجمہ کتاب تقویم الدین ست معلوم می شود این است کہ حضرت امیر صاحب رحمہ اللہ و دفق خلیفتہ لما یحب و یرضا بہ نسبت فرقہ اہلحدیث (کہ عوام آنہا را وہابی گویند) گمان بردہ اند کہ فرقہ مذکورہ معاذاللہ اعتقادات مندرجہ ذیل دارند:۔

اوّل:۔ (نقل کفر کفر نباشد) پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام را دبانی بدحشے)

(بقیہ حاشیہ ص۷) بہ نسبت سائر الناس ہیچ فضیلت و بزرگی نے۔ حضرت سید الانبیا سرور کائنات و فخر موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام خاتم الانبیاء نیست۔ واستغفر اللہ) شفاعت را منکر اند (نعوذ باللہ) بانیٔ این فرقہ عبد الوہاب نجدی ست کہ یہودی النسل بود و در نہانی عداوت اسلام می داشت وغیرہ ہیچو ذٰلکم۔ این چنین افترایات کہ جہلا بہ نسبت فرقہ اہل حدیث مشہور می کنند اصلے ندارد بلکہ این چنین اعتقادات و مقالات را اہلحدیث کفر می دانند۔ نہ اہلحدیث این چنین اعتقادات دارند و نہ عبد الوہاب نجدی را پیشوا خود دانند بلکہ از کیفیت شخصیا و نیز تا داقف اند الا اینقدر کہ در کتب سیر مرقوم ست انگشتہ بدین وجہ کہ ایشان ازین افترایات بری اند بہ شنیدن این چنین مقالات بہ نسبت خود دلشاد مانی می کنند بحکم : سے

نیک باشی و بدت گوید خلق　　بہ کہ بد باشی و نیکت خوانند

البتہ بایں گمان کہ بسا اوقات این چنین افترایات برائے جہال کہ از تحقیق و تفتیش اصل حال بمراحل اند مانع ہدایت اند۔ بحکم اتقوا اللہ مواضع التہم (الحدیث) اہلحدیث بصدد دفع این کفریات می شوند۔ اگرچہ مایان جماعت اہلحدیث زیر سایہ سرکار انگریزی بامن و عافیت ہستیم و باسلطنت خدا داد افغانستان رضی اللہ الیہا و خلد ملکہم ما دام الملوان ہیچ تعلق سیاسی نداریم الا آن نسبت و تعلق کہ خداوند جل مجدہٗ ما را بایمہ کلمہ گویان بحکم انما المؤمنون اخوۃ مضبوط دادہ بنابرین برائے دفعیہ بدگمانی برادران افاغنہ بحضور خدام جناب امارت مآب حضرت امیر حبیب اللہ خان وفقہ اللہ لما یجب و یرضاہ ما نعاقب القرآن عرض داریم کہ از کتاب تقویم الدین جزئے را کہ متعلق بہ اعتقادات فرقہ اہلحدیث ست اصلاح دیا فی حاشیہ ص۹)

بیدار مغز، فرزندانِ روزگار بھی متاثر ہو کر اپنی کتاب تقویم الدین وغیرہ میں اہلحدیث کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم لگا گئے جس میں امیر صاحب مرحوم کا ذرّہ بھر قصور نہیں۔ قصور صرف اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے حضرت ممدوحؒ تک اہلحدیث کی نسبت یہ خیالات پہنچا ئے۔ امیر صاحبؒ مرحوم زندہ ہوتے تو ہم ان کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کرتے کہ:

وإذا أتتك مذمتي من ناقص فهي الشهادة لي بأني كامل[1]

اِن افترایات کے دفع کرنے میں اہلحدیث نے مقدور بھر کوشش کی جو خدا کے فضل سے پوری مؤثر ہوئی چنانچہ اُسی کوشش ہی کا نتیجہ ہے کہ جس نے اہلحدیث کے مذہب سے پوری واقفی حاصل کی بس یہی واقفی اس کی ہدایت کا سبب ہو گئی، یہ رسالہ بھی اُنہی کوششوں میں سے ایک

[1]: جب کسی نالائق سے میری مذمت پہنچے تو یہ سمجھ کہ وہی میرے فضل اور کمال پر دلیل ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) فرمایند اگر ضرورت دریافت اعتقادات فرقہ اہلحدیث باشد قرآن مجید، کتب احادیث اہلِ سنّت را ملاحظہ فرمایند بعد ملاحظہ ہرامر کہ ایں کتب بلا تغیر و تبدیل ثابت شود ہموں مذہب اہلحدیث است یا ہمیں رسالہ را از مطالعہ بخشند تا از عہدہ فرمان خداوندی جلّ مجدہٗ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ برآیند، رجا قوی ہست کہ عرض ہٰذا بحضور بندگانِ عالی مقرون با جابت اُفتد۔

ع آفتاب دولت مدام تاباں و درخشاں باد

عریضہ نیاز:- ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری (مخاطب بمولوی فاضل) مصنّف رسالہ ہٰذا

ہے، اس میں صرف اہلحدیث سے افترا یات ہی کا دفعیہ نہیں ہوگا بلکہ بعض ایسے مسائل کا ذکر بلکہ ثبوت بھی ملے گا جن کو واقعی اہلحدیث مانتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ نہ کسی فریق کی دل آزاری سے نہ کسی مصنف پر حملہ آوری سے بلکہ سلف صالحین کے طریق پر غالباً یہ رسالہ پہلا نمبر ہے جو مذہبی مباحث میں حسب منشا ندوۃ العلما[1] لکھا گیا ہے۔ کیا عجب کہ خاکسار مصنف بحکم حدیث شریف من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

خاکسار مصنف

---

[1] ندوۃ العلما کا مقصد یہ ہے کہ اختلاف بیہودہ پیرائے میں نہ ظاہر کیا جائے۔ جواب اور تردید میں کتابیں لکھی جائیں تو اصل مسائل پر گفتگو کی جائے، تحریر و تشنیع، سب و شتم، لعن طعن سے کام نہ لیا جائے۔ زبانی مناظرہ ہو تو سخت کلامی اور ہاتھا پائی تک نوبت آئے اور مقدمہ بازی میں فریقین کے ہزاروں روپے برباد نہ ہوں۔ جس میں ایسے نقصان مایہ دیگر شماتت ہمسایہ کے علاوہ ہماری ناشائستہ حرکات سے اسلام کے منور چہرے پر بدنما دھبہ نظر آئے۔ (مقصد دوم ندوۃ العلما) ہماری عبارت میں منشا سے مراد یہی مقصد ہے۔ (منہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اہلحدیث کا مذہب

توحید اہلحدیث کا مذہب ہے کہ خداوند تعالیٰ سب چیزوں کا خالق ہے۔ سب مخلوق کیا چھوٹی کیا بڑی، کیا عزیز، کیا ذلیل اُس کے سامنے سب کی سب سرِ تسلیم ہیں۔ کوئی بھی اُس کے حکم کو پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ سب دُنیا کی اصلی حکومت خاص اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

یعنی برکتوں والی ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام ملک کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرتِ تام رکھتا ہے۔ نیز ارشاد :۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔

یعنی اے رسول اصلی اللہ علیہ وسلم تو ان مشرکوں سے پُوچھ کہ کون ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سب چیزوں کی حکومت ہے اور وُہ سب کو پناہ دیتا ہے اور اُس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اگر تہیں

علم ہے تو بتلاؤ، تو یہ یہی کہہ دیں گے کہ ایسی شان خدا ہی کی ہے۔

اس مضمون سے تو قریب قریب تمام قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ بلکہ کلمہ شریف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی میں یہ بیان بالاجمال پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے معنی ہیں خدا کے سوا اور کوئی حقیقی معبود نہیں، صرف خدا ہی معبود برحق ہے، باقی تمام مخلوق اس کی عابد اور مخلوق ہے پس عابد کو معبود سے جو نسبت ہوتی ہے وہی تمام مخلوق کو (نبی ہو یا ولی۔ رسول ہو یا اُمتی۔ مومن ہو یا کافر) خالق سے ہے۔ پھر جس نے اس نسبت کو پورا نباہا وہ تو خدا تعالیٰ کے نزدیک معزز ہوا جیسے انبیاء و اولیا علیہم الصلوٰۃ —— اور جس نے اس نسبت کے حقوق ادا نہ کیے وہ ذلیل و خوار مستوجب سزا ٹھہرا۔

قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الاٰیۃ

(یعنی انسان کو خدا نے سب سے اچھی قابلیت اور لیاقت پر پیدا کیا ہے۔ پھر اُس کی بدکاریوں کی وجہ سے اس کو ذلیل ترین کر دیا لیکن جو لوگ ایمان دار ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اُن کی یہ حالت نہیں وہ خدا کے نزدیک معزز ہیں)

مختصراً یہ کہ ہمارا ایمان اور عقیدہ یہ ہے کہ:۔

وہ مالک ہے سب آگے اُس کے لاچار نہیں ہے کوئی اُس کے گھر کا مختار

رسالت اور ولایت

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ تمام مخلوق میں سید البشر انبیاء علیہم السلام ہیں اور

انبیاء میں سیدالانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو قیامت کے دن شفاعت کبریٰ وصغریٰ کریں گے کیونکہ خدا فرماتا ہے: اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (یعنی جو لوگ زیادہ متقی اور پرہیزگار ہیں وُہی اللہ کے نزدیک زیادہ معزز اور مقرب ہیں) یہ تو ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام کے برابر کوئی شخص تقویٰ نہیں کرسکتا۔ نیز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انا سیّد ولد آدم ولا فخر (میں اولادِ آدم کا سردار ہُوں، اور بطور فخر نہیں کہتا بلکہ بطور تعلیم بتلاتا ہُوں) اسی آیت کے مطابق اولیاء اللہ عام اُمت سے افضل ہیں کیونکہ آیت موصوفہ نے ایک عام قاعدہ بتلایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قرب اور اکرام کا مدار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے، پس جو کوئی جس قدر تقویٰ شعار ہوگا اُسی قدر خدا کے نزدیک مکرّم و محترم ہوگا۔

توہین سلف اہلحدیث کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی توہین کرنے والا کافر ہے اور اولیاء کی (جن کا تقویٰ طہارت معلوم اور ثابت ہو) توہین کرنے والا یا اُن کی نسبت بدی یا تحقیر کرنے والا فاسق ہے۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والوں کی نسبت خدا نے فرمایا: اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا (یعنی جن لوگوں نے تیرے حق میں بُری بُری تمثیلیں دی ہیں وہ ایسے گمراہ ہوئے ہیں کہ اُن کی ہدایت کی کوئی صورت ہی نہیں)۔ حدیث قدسی میں ہے من عادی لی ولیا فقد اٰذنته بالحرب (یعنی خدا

نے فرمایا کہ جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے میرا اُس سے اعلان جنگ ہے، پھر اُس کی خیر کہاں) بلکہ عام مومنوں کی توہین اور تذلیل کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، خاص کر جو لوگ ہم سے پہلے ایمان دار ہو گذرے ہوں اُن کی نسبت تو نیک دُعا کا حکم ہے۔ قرآن شریف میں تعلیم ہے:۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

اے اللہ ہم کو بخش اور ہمارے بھائیوں کو جو ایمانداری کے ساتھ ہم سے پہلے گذرے ہیں اُن کو بھی بخش اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کا کینہ نہ کر، آمین

مختصر یہ ہے کہ اہلحدیث کا مذہب توہینِ سلف کے حق میں وُہی ہے، جو صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے لا نقبل شہادۃ من یظہر سب السلف لظہور فسقہ (کتاب الشہادت) یعنی جو سلف صالحین کو بُرا کہے اُس کی شہادت معتبر نہیں۔

علم غیب اہلحدیث کا مذہب ہے کہ سوائے خدا کے علم غیب کسی مخلوق کو نہیں، نہ ذاتی نہ وہبی نہ کسبی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

لہ: اس دعویٰ اور دلیل کی نسبت امرتسر کے علماء حنفیہ نے مجالسِ وعظ میں بڑی سختی سے اعتراضات کرنے شروع کیے، کبھی دعویٰ اور دلیل میں عدم مطابقت پر (لا)، کبھی مستثنیٰ پر کلام کبھی کفر کا لزوم۔ غرض کبھی کچھ کبھی کچھ، آخر بات بڑھتے بڑھتے مباحثہ کی ٹھیری اور مولانا ابو عبید احمد اللہ صاحب امرتسری اور مولانا ابو محمد عبد الحق صاحب مصنف تفسیر حقانی دہلوی منصف قرار پائے اور ۳ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ کو بموجودگی منصفان مباحثہ (باقی بر صفحہ ۱۵)

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ
یعنی اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دے کہ تمام آسمانوں اور زمین والوں

(بقیہ حاشیہ ص۱۴) ہوا۔ فریقین کی تقریریں سن کر ہر دو منصفان نے بیک زبان فیصلہ کیا کہ عبارت مذکورہ صحیح ہے، پھر فریق ثانی نے خفیہ طور پر ایک استفتار علماء دیوبند کی خدمت میں بھیجا جس کی نقل میرے ایک دوست (کان اللہ لہٗ) مدرس مدرسہ دیوبند نے مع دستخط مدرسین میرے پاس بھی بھیجی جو بطور اشتہار شائع کی گئی ہے، جو یہ ہے :۔

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس شخص کے حق میں کہ جس نے مندرجہ ذیل دو عبارتیں ایک رسالہ میں شائع کی ہوں۔ اولاً یہ کہ سوائے خدا کے کسی مخلوق کو علم غیب نہیں۔ نہ ذاتی، نہ وہبی، نہ کسبی کیونکہ خدا فرماتا ہے: "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ" دعوی دلیل میں تطابق اور آیت کریمہ سے استناد صحیح ہو سکتی ہے یا نہیں اور جو شخص اس قسم کا دعوی کرے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ کو مطلقاً علم غیب نہ تھا نہ ذاتی، نہ وہبی، نہ کسبی۔ پس وہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخبر باخبار ماضیہ وحالیہ واستقبالیہ کے منکر ہونے سے کافر ہوا یا نہیں ؟

ثانیاً "عابد کو معبود سے جو نسبت ہوتی ہے وہی عام مخلوق کو نبی ہو یا ولی، رسول ہو یا امتی، مومن ہو یا کافر، خالق سے ہے۔" اب اس عبارت میں لفظ عابد غور طلب ہے، لفظ عابد سے من حیث انہ مطیع وعابد مراد لیا جائے گا یا مخلوق من حیث ھو ھو؟ (باقی بر ص۱۶)

ہیں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ نیز ارشاد ہے:۔

لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ

یعنی اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو کہدے کہ اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سی بھلائی اپنے لیے جمع کر لیتا اور مجھے کسی طرح کی بھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

اس نص قطعی کے علاوہ سینکڑوں واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہیں جن سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ حضور فداہ روحی کو علم غیب نہ تھا، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے افک کا قصہ کہ حرم محترم پر بہتان لگنے سے کئی دنوں تک مغموم و محزون رہے مگر اصل حال معلوم نہ ہو سکا۔ جب تک خدا نے اطلاع نہ دی۔ ایسے ہی دیگر انبیاء علیہم السلام کے حالات شاہد عدل ہیں کہ کسی کو علم غیب نہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کا مہمانوں کی شکل میں آنا اور حضرت ابراہیم کا اُن سے ڈر جانا جو قرآن کی صریح آیات میں مذکور ہے، حضرت لوطؑ کے پاس ملائکہ کا لڑکوں کی شکل میں آنا اور حضرت لوطؑ کا اپنی قوم سے ان کو چھپا

(بقیہ حاشیہ صفحہ) پس بر تقدیر اول بلحاظ عبادت و اطاعت مساوات و مماثلت انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کی کفار ناہنجار سے ثابت کرنے والا کافر ہوا یا نہیں؟ بر تقدیر ثانی اس کی غرض تنقیص شان حضرات اور ان حضرات کا بعد الانتقال توسل نہ ہونا اس سے ثابت ہوگا یا نہیں بیّنوا توجروا

عہ یہ عبارت کتاب ہذا کے صفحہ ۵ اسطر ا پر ہے۔ (منہ) (جواب بر صفحہ ۱۷)

وغیرہ صریح قرآن میں مذکور ہے جو عدم علم پر دلالت تام کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بوجہ بے خبری اور عدم واقفیت اصل حال کے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو قصوروار سمجھ کر بے حرمت کرنا اور اُن کا نہایت ہی عاجزانہ لہجہ میں اصل حال بتلانا وغیرہ وغیرہ سب کے سب واقعات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) الجواب :- اصطلاحاً عالم الغیب سے مراد ہے کہ جمیع مغیبات کا کلیتہً وجزئیتہً اذلاً وابداً عالم ہو، سو یہ شان باری تعالیٰ کی ہے اور کوئی مخلوق میں سے شریک اس کا اس وصف میں نہیں، سو اگر مراد قائل کی یہ ہے کہ ایسا علم کسی کو نہیں. نہ ذاتی نہ وہبی نہ کسبی، پس دلیل مطابق دعویٰ ہے کما ھو ظاھر من الاطلاق ولا یشك فیہ غیر اھل الشقاق اور جو غرض یہ ہے کہ بعض مغیبات کا علم کسی کو کسی طرح نہیں تو غلط ہے کیونکہ بہت سے مغیبات کا علم انبیاء کرام کو خصوصاً افضل الرسل خاتم الانبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عطا ہوا ہے اور اُن حضرات کرام کے وساطت سے اُن کی اُمتوں کو بھی بہت سی مغیبات کا علم حاصل ہوا ہے خود قرآن شریف میں ہے عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ الآیۃ پس انکار اس کا خلاف منصوص ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ قائل مذکور کی غرض قسم ثانی کا انکار نہیں بلکہ علم غیب علی الاطلاق کی نسبت یہ قول ہے۔ سو معلوم ہوا کہ صحیح ہے اور عقیدہ اہل سنت والجماعۃ حسب نصوص قطعیہ یہی ہے کہ عالم الغیب علی الاطلاق بجز ذات باری تعالیٰ کوئی نہیں، اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہتے ہیں سخت ضلالت میں ہیں اور مفتری کذاب ہیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے ایسا ہی فرمایا ہے کما رواہ البخاری (ربانی بدحصہ ۱)

صاف بتلا رہے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو علم غیب نہ تھا، یہ تو قرآن و حدیث کے صریح دلائل ہیں فقہاء رحمہم اللہ نے بھی ان ہی واقعات پر بنا کر کے انبیا کی نسبت علم غیب کے عقیدے کو کفر لکھا ہے ۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں :-

واعلم ان الانبیاء لم یعلموا ۔ جان لو کہ انبیاء غیب نہیں جانتے تھے لیکن

(بقیہ حاشیہ ص۱۷) درحقیقت یہ شرک ہے ۔ صفات خاصہ باری تعالیٰ میں امر ثانی کی نسبت یہ تفصیل ہے کہ درحقیقت جملہ مخلوقات بندہ و عاجز و مخلوق ہونے میں برابر ہیں کسی کو خالق جل و علا کے ساتھ شرکت نہیں ہے ، پس اس نسبت میں عابد و غیر عابد و انبیاء عظام و اولیاء کرام جملہ مخلوق برابر ہیں ۔ یہ ہی مطلب قائل کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ کوئی مسلمان اس امر کا منکر نہیں کہ جو قرب حق تعالیٰ کے خاص بندگان مقربین کو ہے وُہ دوسروں کو نہیں ۔ اس نسبت قرب میں جملہ مومنین بھی برابر نہیں اور انبیاء عظام و اولیاء کرام یکساں نہیں تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر جملہ سے مراد ہیں سو ان کی رفع درجات کی کوئی کیا تفصیل و تشریح کر سکتا ہے :- ؎

لایمکن الثناء کما کان حقہ ۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

صاحب بردہ نے کیا خوب فرمایا ہے :- ؎

فانسب الی ذاتہ ماشئت من شرف ۔ وانسب الی قدرہ ماشئت من عظم

فان فضل رسول اللہ لیس لہ ۔ حد فیعرب عنہ ناطق بفم

فمبلغ العلم فیہ انہ بشر ۔ وانہ خیر خلق اللہ کلہم

(باقی بر ص۱۹)

المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمهم الله تعالیٰ احیانا وذکروا الحنفیۃ تصریحا بالتکفیر باعتقاد ان النبی علیہ السلام یعلم الغیب لمعارضۃ قولہ تعالیٰ قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (شرح فقہ اکبر)	اتنا ہی جتنا کہ کبھی کبھی خدا ان کو بتلاتا اور علماء حنفیہ نے صاف کہا ہے کہ جو کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت علم غیب کا اعتقاد کرے وہ کافر ہے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے، اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا (شرح فقہ اکبر)

ایسا ہی فتاویٰ قاضی خاں میں جو فقہ کی ایک مشہور اور معتبر کتاب ہے صاف مرقوم ہے:

رجل تزوج بغیر شہود فقال الرجل والمرأۃ خدا ورسول را گواہ کردیم	جو شخص اپنے نکاح میں خدا اور رسول کو گواہ کرے وہ کافر ہے کیونکہ اس گواہ کرنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) الحاصل باوجودیکہ جملہ کمالات کے بشر بشر اور مخلوق ہے کوئی جزو معبودیت وخالقیت کا اس میں نہیں آیا۔ پس یہی مطلب اس قائل کا معلوم ہوتا ہے ورنہ قرب خاص وعلو درجات ورفع مقامات بندگانِ خاص کا کوئی منکر ہوسکتا ہے؟ مسلمانوں پر حسنِ ظن لائق ہے اور اُن کے کلام کو محمل حسن پر حتی الوسع واقع کرنا چاہیے بے وجہ تفسیق وتضلیل مناسب نہیں بلکہ حرام وممنوع ہے فقط واللہ اعلم۔

کتبہٗ:۔ عزیز الرحمٰن عفی عنہ دیوبندی (مفتی مدرسہ) الجواب صحیح محمد حسن عفی عنہٗ الجواب صحیح غلام رسول عفی عنہٗ الجواب صحیح احقر الزماں گل محمد خاں عفی عنہ (مدرس عربیہ عالیہ دیوبند) الجواب صحیح بندہ محمود عفی عنہ (مولانا محمود الحسن صاحب اول) الجواب صحیح بندہ مسکین محمد یٰسین عفی عنہٗ۔

قالوا یکون کفرا لانہ اعتقد انّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیبَ وھُوَمَاکَانَ یعلم الغیب حین کان فِی الاحیاءِ فکیف بعد الموت (قاضی خانؒ باب مایکون کفرا من المسلم ومالایکون)	سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس نے اس بات کا اعتقاد کیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے۔ جب حضور زندگی میں غیب نہ جانتے تھے تو بعد انتقال کیونکر جانتے ہوں گے ؟

ایسا ہی حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ "مالا بدّ" میں فرماتے ہیں :-

"اگر کسے بدون شہود نکاح کرد وگفت کہ خدا و رسول را گواہ کردم یا فرشتہ را گواہ کردم کافر شود"۔ اسی مقام کے حاشیے پر اس کفر کی دلیل لکھی ہے کہ "چراکہ آنکس اعتقاد کرد کہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم غیب می داند وپیغمبر خدا در حالتِ حیات غیب رانمی دانست پس چگونہ بعد موت غیب داند۔

(کذا فی قاضی خان)

جب انبیاء علیہم السلام کو علمِ غیب نہ ہوا تو آئمہ اہلبیت اور دیگر صلحاء امّت کو کیسے ہوسکتا ہے ؟ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں خدا نے آنحضرتؐ کی بابت فرمایا ہے : وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ خدا نے تجھ کو وہ باتیں سکھائیں جو تُو نہ جانتا تھا اور ما کا لفظ عام ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو کل چیزوں کا علم سکھایا گیا۔ پس علمِ غیب اسی کا نام ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ یہی لفظ عام مسلمانوں کے حق میں بھی فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے :- كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (یعنی جو تم نہ

جانتے تھے وُہ تم کو سکھایا) تو کیا ہم سب مسلمان جن کو اس آیت میں خطاب ہے سب کو علم غیب ہے ؟ ہرگز نہیں۔ پس اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت اس لفظ کا ورود ہوا ہے یعنی دینی باتیں جو تو نہ جانتا تھا وُہ تجھ کو سکھائیں اور تم مسلمان بھی جن دینی اُمور سے ناواقف تھے وُہ تم کو بتلائے چنانچہ ایک آیت میں ان معنی کی مزید تشریح بھی فرما دی ہے، جہاں ارشاد ہے:
مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (یعنی تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے تیرے دل میں ایک نور پیدا کیا") اس سے علم غیب کا کیا ثبوت و کیا ذکر ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اوتیت علم الاوّلین والاخرین (یعنی مجھ کو پہلوں اور پچھلوں کا علم عطا کیا گیا ہے) اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم غیب ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے معنی بھی یہ ہیں کہ جو کچھ معرفت خداوندی کا علم پہلے نیک لوگوں کو حاصل تھا، یا مجھ سے پچھلے لوگوں کو حاصل ہوگا وُہ سب معرفت مجھے حاصل ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل اولادِ آدم کے سردار ہیں اور سب سے زیادہ متقی۔ پس آپ کی معرفت سب سے زیادہ ہونے میں کس کو کلام ہے ؟ اور واضح طور سے سُنیے ! حدیث مذکور میں علم کا لفظ مصدر مضاف ہے اوّلین کی طرف جو فاعل ہے پس یہ معنی ہوں گے کہ جتنا علم پہلے اور پچھلے لوگوں کا تھا اور ہوگا وُہ سب

مجھے حاصل ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ بحکم قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ پہلے پچھلے کسی کو غیب نہیں ملا۔ پس علم الاولین والآخرین سے مراد یہی ہے کہ جتنا علم شریعت پہلے پچھلوں کا ہے وہ سب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ اگر اس حدیث میں آنحضرت کی غیب دانی کا ثبوت ہو تو قرآن کی آیت مذکورہ اور اہل سنت کے تمام فقہا و محدثین و اولیاء کاملین کے صریح خلاف ہوگا۔ علاوہ اس کے قرآن شریف میں صاف ارشاد ہے کہ ما ادری مایفعل بی ولا بکم (یعنی اے رسول تُو ان سے کہہ دے کہ مجھے نہیں معلوم۔ آئندہ کو مجھے کیا کیا امور پیش آنے والے ہیں اور تمہیں کیا)

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علم الاولین والآخرین سے مراد وہ وہ واقعات اور حوادثات ہوں جو قرآن وحدیث میں پہلے اور پچھلے لوگوں کے حضور نے بیان فرمائے ہیں جن کو غیب دانی سے کوئی بھی تعلق نہیں کیونکہ جتنا کچھ خدا نے بتلایا اُس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ انکار تو اس سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور نبی یا ولی کو سب اشیاء کا علم تھا جیسا کہ آج کل کہا جاتا ہے یا صرف اسی قدر تھا جو خدا کی طرف سے بتلائی گئی تھیں جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث شریف میں آتا ہے جیسے گذشتہ اور آئندہ واقعات کی خبریں حضور نے بتلائی ہیں۔ اس قسم کی اور بھی احادیث ہیں جن سے اس امر کے ثابت کرنے کی ناکام سعی کی جاتی ہے کہ حضور اقدس فداہ ابی و امی کو علم غیب تھا، مگر تعجب ہے کہ ایسے ایک بدیہی امر کے برخلاف کوشش

کی جائے جس کے ثبوت کے لیے قرآن وحدیث بلکہ فقہا کی متفقہ تصریحات بھی موجود ہوں الی اللہ المشتکیٰ۔

استمداد بالغیر

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی دافع بلا اور جالب نفع نہیں ہے یعنی کسی حالت اور کسی صورت میں بھی کسی مخلوق کو یہ قوت نہیں کہ ہمارے آڑے کام سنوار دے یا بگڑی کو بنا دے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پاک کو ارشاد فرمایا ہے قُلْ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (اے ہمارے رسول! تو کہہ دے کہ میں تمہارے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا) بلکہ ایک آیت میں فرمایا ہے کہ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یعنی مجھے اپنی جان کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں) برابر جس طرح دوسروں کو مضرات سے ضرر اور تکلیف پہنچتی تھی آپ کو بھی پہنچتی تھی۔ خیبر کے زہر کا قصہ مشہور ہے کہ ایک ہی لقمہ کھانے سے اخیر تک اس کی تکلیف رہی۔ آخر انتقال فرمانے کے وقت بھی اس نے اپنا اثر دکھایا جس سے طبیعت میں گونہ حرارت بڑھ گئی۔ آیت قرآنی اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[1] انہی معنی میں شاہد عدل ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ تمام مخلوق میں حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم افضل اکمل بلکہ سید الاکملین ہیں۔ پس افضل و اکمل کی نسبت خدا تعالیٰ نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ ان کو بھی ہمارے نفع و نقصان کا اختیار نہیں دیا گیا۔ باقی سب مخلوق تو اس سے نیچے بلکہ انہی سے فیض یاب ہے، کیا ہی سچ ہے ؎

---

[1] : میں بس تمہاری طرح آدمی ہوں۔ (منہ)

گو غوث و قطب و مقتدا ہے وہ بھی اسی در کا اک گدا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں جو وصف کمال نہ ہو وہ کسی دوسرے میں اعتقاد یا تلاش کرنا صریح بے ادبی اور سراسر گمراہی ہے پس اسی ایک ہی آیت سے مضمون صاف ہے کہ کسی مخلوق کو یہ طاقت اور یہ قدرت نہیں (نہ ذاتی نہ وہبی) کہ وہ ہماری کسی طرح کی مشکل کشائی کر سکے یا ہم اُس سے استمداد و استعانت کریں جیسا کہ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ والی آیت سے ایک عام قاعدہ معلوم ہوتا ہے اسی طرح دوسری آیت میں بھی بطور ایک قاعدہ کلیہ کے فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے : لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ (یعنی تم کسی ایسی چیز کو مت پکارا کرو جو نہ تم کو نفع دے سکے اور نہ نقصان پر قادر ہو، اگر ایسا کرو گے تو تم بھی ظالم ہو جاؤ گے) پہلی آیت نے ہم کو یہ بتلایا کہ سوائے خدا کے کوئی بھی نہیں جو ہم کو نفع یا نقصان دے سکے کیونکہ جب سید الانبیا کو اس امر پر قدرت نہیں جیسا کہ آیاتِ مرقومہ کا صریح مطلب ہے تو پھر اور کسی کو کیا یارا ؟ دوسری آیت نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ جو چیز ہم کو نفع یا نقصان دینے پر قادر نہ ہو اس سے دعا نہ کریں، نہ کسی آڑے کام میں اس کو پکاریں، نہ استمداد کریں، پس داناؤں کے لیے مضمون بالکل صاف ہے۔

قرآن شریف کا تو کوئی پارہ بلکہ کوئی رکوع تک اس تعلیم سے خالی نہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی غرض بھی یہی ہے کہ مخلوق کو مخلوق کے پکارنے سے روکا جائے، یہی معنی ہیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے یعنی اے ہمارے مولا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہر ایک کام کی انجام دہی میں تجھ ہی سے

مدد چاہتے ہیں۔

عرب کے لوگوں میں کئی ایک حضرت مسیح کو پکارتے تھے کئی ایک حضرت عُذیر علیہ السّلام کو، کئی ایک دیگر بزرگانِ دین سے دُعائیں مانگتے تھے، اُن کی تردید اور توحید کی تائید کرنے کو خدا تعالیٰ نے اپنی صفاتِ کاملہ کا بیان کر کے فرمایا ہے کہ:-

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ	یہ اللہ تمہارا پروردگار ہے اُسی کا سب ملک اور
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا	اختیار ہے اور اللہ کے سوا جن لوگوں کو تم
يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ اِنْ تَدْعُوْهُمْ	پکارتے ہو وُہ ذرہ بھی اختیار و قدرت نہیں
لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا	رکھتے، اگر تم اُن کو پکارو تو وُہ تمہاری دُعا سنتے
مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	نہیں اور اگر سنیں تو تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتے
يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۔	اور قیامت کے روز تمہارے شرک سے انکار کریں گے
(پ ۲۲ - ع ۱۴)	(کہ ہم نے ان سے نہ کہا تھا نہ یہ لوگ ہم کو پکارتے تھے)

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگوں کو لوگ پکارتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں، اُن کو ان دُعاؤں کا علم بھی نہیں چنانچہ دُوسری آیت میں صاف مذکور ہے وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ یعنی جن بزرگوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وُہ ان کی دُعاؤں سے بے خبر ہیں پس آڑے وقت میں جو لوگ پیروں فقیروں سے امداد چاہتے ہیں یا دُعا کرتے ہیں، قرآن و حدیث کی رُو سے ان کا یہ فعل شرک ہے جو صریح کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور آیت اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف ہے، گو ایسے صاف مضمون کے لیے جو کلمۂ شریف

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کا ترجمہ ہو کسی بیرونی شہادت یا تائید کی حاجت نہیں تاہم ہم اپنے بھائیوں کی مزید تشفی کے لیے فریقین کے مستند بزرگ یعنی حضرت محبوب سُبحانی مخدوم جہانی مولانا شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کے ملفوظات شریفہ میں سے چند کلمات طیبات نقل کرتے ہیں، حضرت موصوف فتوح الغیب کے مقالہ نمبر ۴۲ میں فرماتے ہیں :-

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال بینا انا ردیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ قال یٰغلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدہ امامک فاذا سالت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ جف القلم بما ھو کائن ولو جھد العباد ان ینفعوک بشیئ لم یقضہ اللہ لک لم یقدروا علیہ ولو جھد العباد ان یضروک بشیئ لم یقضہ اللہ علیک لم یقدروا فان استطعت ان تعمل للہ بالصدق فی الیقین

ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک وقت میں جبکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا مجھ سے مخاطب ہو کر حضور نے فرمایا: اے بیٹا! تو خدا کے حقوق کی نگہداشت کر خدا تیری حفاظت کرے گا تو خدا کے حقوق محفوظ رکھ تو خدا کو اپنے سامنے پا دے گا۔ (جس کی تفصیل یہ ہے) کہ جب تو سوال کرے تو اللہ ہی سے کیا کر اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہا کر۔ جو کچھ ہونا ہے ہو چکا ہے۔ اگر تمام مخلوق تجھے کچھ فائدہ پہنچانا چاہے جو خدا نے تیرے لیے مقدر نہ کیا ہو تو کبھی قدرت نہ پا سکیں گے اور اگر تمام مخلوق تجھے کسی قسم کے ضرر پہنچانے کا ارادہ کرے جو

فاعمل دان لم تستطع فاصبر	خدا نے تیرے حق میں مقدر نہ کیا ہو تو کبھی
فان فی الصبر علی ما تکرہ خیرا	سکیں گے پس اگر تو طاقت رکھے کہ سچائی
کثیرا داعلم ان النصر مع	یقین کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرے تو کر اور اگر
الصبر و الفرج مع الکرب	کی طاقت نہیں رکھتا تو تکلیفوں پر صبر کیا کر
دان مع العسر یسرا ۔ فینبغی	صبر میں ہی بہت سی بھلائی ہے اور تو جان
لکل مؤمن ان یجعل ھٰذا	اللہ کی مدد صبر کے ساتھ اور آسانی تکلیف سے
الحدیث مرآۃ لقلبہ وشعارہ	متصل اور تنگی کے ساتھ آسانی (اس حدیث کے
ودثارہ وحدیثہ فیعمل	حضرت پیر صاحب فرماتے ہیں) پس ہر مسلمان کو چاہیے
بہا فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ	کہ اس کو اپنے دل کا آئینہ اور اپنے جسم کا بیرونی و اندرونی
حتی یسلم فی الدنیا و	لباس بنائے اور اپنی ہر ایک بات میں اسی کو پیش نظر
الاٰخرۃ و یجد العزۃ فیہا	رکھے اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں اسی پر عمل
برحمۃ اللہ عز وجل ۔	کرے (کہ خدا کے سوا کسی مخلوق سے التجا اور استعانت
(مقالہ نمبر ۴۲)	نہ کرے نہ کسی سے اُمید نفع و نقصان کی رکھے) تا کہ

دنیا اور آخرت میں سلامتی سے رہے اور اللہ کی رحمت سے عزت پا دے۔"

غرض اس مسئلہ میں اہلحدیث کا مذہب وُہی ہے جو حضرت فریدالدین عطار نے فرمایا ہے : ؎

در بلا یاری مخواہ از ہیچ کس　　　ز انکہ نبود جز خدا فریاد رس

غیر حق را ہر کہ خواند اے پسر　　　کیست در دنیا از و گمراہ تر

ہاں ! ہمارا یہ بھی مذہب ہے کہ نیک بندوں کی دعا سے فائدہ ہوتا ہے

احادیث تو اس بارے میں بہت سی وارد ہیں جن کا مضمون صریح ہے کہ صحابہ
کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے طالب
ہوتے تھے اور آپ حسب منشا اُن کے دعا فرماتے، قرآن شریف میں بھی
یہ اشارہ بالاجمال پایا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نیک بندوں کی دعائیں بہ نسبت
دوسرے لوگوں کے جلد تر قبول فرماتا ہے، مگر دعا کا قبول کرنا بھی خدا تعالیٰ ہی
کے اختیار میں ہے اور قبول کر کے فائدہ پہنچانا بھی اُسی کے قبضہ میں ہے، مختصر
یہ کہ اس مسئلہ میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ :- ؎

خدا فرما چکا قرآن کے اندر * مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
نہیں طاقت سوا میرے کسی میں کہ کام آوے تمہاری بیکسی میں

لیکن کسی بزرگ کو مخاطب کر کے یوں کہنا : ؎

امداد کن، امداد کن، از بندِ غم آزاد کن
در دین و دنیا شاد کن، یا شیخ عبدالقادرا

اچھا طریق نہیں۔ کیونکہ قرآن و حدیث میں غیروں سے ایسی آرزو کرنے کو شرک
کہا گیا ہے جس کا بیان اوپر ہو چکا۔ ع در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

اِن تینوں مسئلوں (توحید۔ علم غیب۔ استمداد بالغیر) کو گو ہم نے کسی مصلحت
سے الگ الگ بیان کیا ہے، مگر حقیقت میں یہ تینوں مسئلے توحید میں مندرج ہیں
اور کلمہ شریف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ترجمہ ہیں فافہم و لا تکن من الذین
لا یعلمون و یتبعون الذین لا یعلمون، وقد قال اللہ تعالیٰ و لا تتبعانّ
سبیلَ الذین لا یعلمون۔

یہی مسائل ہیں جن کی وجہ سے اہلحدیث کو وہابی وغیرہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اہل بیت کی محبت شدیدہ کی وجہ سے بعض جاہل رافضی کہتے تھے جن کے جواب میں امام موصوف نے فرمایا تھا:۔ ؎

ان کان رفضًا حب آل محمّد
فلیشھد الثقلان انی رافضی

یعنی اگر رفض اہل بیت رسول کی محبت ہی کا نام ہے تو جنو! اور انسانو! تم گواہ رہو کہ میں رافضی ہوں۔ اسی طرح اہلحدیث بھی امام موصوف کے شعر میں تھوڑا سا تصرف کرکے اس لقب کی نسبت اپنا اظہار رائے کرتے ہیں۔

ان کان توحید الالٰہ توھبا فلیشھد الثقلان انی واھبی

یعنی اگر توحید خداوندی سے آدمی وہابی بنتا ہے تو جنو! اور انسانو! تم گواہ رہو کہ ہم وہابی ہیں۔

خلافت راشدہ

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ خلافت راشدہ حق ہے یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین خلفاء راشدین تھے۔ ان کی اطاعت بموجب شریعت سب پر لازم تھی کیونکہ خلافت راشدہ کے معنی نیابت نبوت کے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور نے اپنی زندگی ہی میں اپنا نائب بنایا تھا۔ مرض الموت میں صدیق اکبر کو امام مقرر کیا حالانکہ عائشہ صدیقہ بنت ابوبکرؓ نے یہ سوچ کر کہ کہیں حضرت انتقال فرما گئے تو میرے باپ کی نسبت لوگوں کا گمان بد نہ ہو کہ ایسا امامت پر کھڑا ہوا کہ آنحضرتؐ

جانبر نہ ہُوئے۔ عرض کیا کہ حضرت ابوبکرؓ بڑے رقیق القلب ہیں (وہ آپ کی جگہ پر امامت نہیں کر سکیں گے) آپ عمر فاروقؓ کو امام بنادیجیے مگر آپ نے ایک نہ سُنی بلکہ نہایت خفگی سے فرمایا انتن صواحب یوسف (تم ویسی ہی عورتیں ہو جو یوسف کو بہکاتی تھیں) یعنی زلیخا نے دعوت میں بلایا تھا اور انہوں نے بھی یوسف علیہ السلام کو زلیخا کی طرف ناجائز میلان کرنے کی رغبت دی تھی تم بھی اُسی طرح مجھ کو ایک ناجائز کام کی رغبت دیتی ہو کہ میں ابُوبکرؓ کے ہوتے ہُوئے کسی دُوسرے کو منصب امامت پر مامور کر دوں، چنانچہ صدیق اکبرؓ برابر نماز پڑھاتے رہے، آخر سرورِ عالم کے انتقال پُر ملال کے بعد حضرت ابوبکر کو سب نے خلیفہ مان لیا، اتنا بالاجمال واقعہ تو سُنی شیعہ دونوں گروہوں کا متفقہ ہے، ایک حدیث جو خاص اہل سنت کی روایت سے ہے، اس امر کا قطعی فیصلہ کرتی ہے جس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو فرمایا تھا کہ :-

عن عائشۃ قالت قال لی رسول	اپنے باپ ابوبکرؓ اور بھائی عبدالرحمٰن کو
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ	بلاؤ کہ میں خلافت کا فیصلہ لکھ دوں۔
ادعی لی ابابکر اباك واخاك حتی	ایسا نہ ہو کہ میرے بعد کوئی کہنے لگے کہ میں خلافت
اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی	کا حقدار ہوں، حالانکہ خدا کو اور سب
متمن ویقول قائل انا ولا ویابی اللہ	مومنوں کو ابوبکر کے سوا کوئی بھی منظور
والمؤمنون الا ابابکر (مسلم)	نہ ہوگا۔

اس حدیث سے نہ صرف خلافتِ صدیقیہ کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ اُس مشہور مسئلہ قرطاس کا بھی تصفیہ ہوتا ہے، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے قلم دوات

طلب فرمانے پر صحابہ کے انکار و اقرار کا مشہور ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ قلم دوات منگا دو۔ میں تم کو کچھ لکھ دوں کہ میرے بعد جھگڑا نہ ہو۔ اس پر صحابہ کا باہم خیال اختلاف رہا کہ حضور کو بیماری میں تکلیف ہو گی۔ آخر آپ خلافت کی بابت ہی کچھ لکھوائیں گے حسبنا کتاب اللہ (ہم کو کتاب اللہ قرآن مجید کافی ہے) کیا ضرور ہے کہ حضور کو ایسی تکلیف میں اور تکلیف بڑھا دیں۔ اس دلیل کے پیش کرنے والے حضرت فاروق تھے۔ جن کی قوتِ استدلال سب کو مسلّم تھی چنانچہ اکثروں نے ان سے اس رائے میں اتفاق کیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے وقت میں تکلیف دینی گوارا نہ کی۔ آنحضرت نے بھی معمولی اظہار ناراضگی کر کے جیسے کہ عموماً کسی ہمدرد بزرگ کو ایسے موقع پر ہوتی ہے ان کو اٹھا دیا اور فرمایا کہ میں اس وقت جس شغل میں میں ہوں تمہارے شغل سے کہیں بہتر ہے۔ اس واقعہ پر فریقین (سُنی شیعہ) کی رائیں اور توجیہیں مختلف ہیں شیعہ کہتے ہیں مضمون اُس کتاب کا جو آنحضرت نے لکھنی چاہی تھی خلافت علی کی وصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عمرؓ نے اس باب میں مزاحمت کی، اہلِ سنت کا قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر لکھتے تو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت لکھتے مگر آپ نے لکھنے کو ضروری نہ سمجھا کیونکہ آپ بطور پیش گوئی فرما چکے تھے کہ یابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر (خدا اور مومنوں کو سوائے ابوبکرؓ کے کوئی پسند ہی نہ ہو گا) اسی وجہ سے عائشہ صدیقہ کو ابوبکرؓ کے بلانے کی بابت ارشاد کر کے خاموش ہو رہے اور اسی وجہ سے اس وقت بھی سکوت اختیار کیا۔ یہ حدیث اہل سنت کے لیے ایک قوی دلیل ہے کہ خلافت صدیقی منظور نبوی تھی۔

نیز مسئلہ قرطاس کی بابت صریح تصفیہ ہے کہ حضور وُہی بات لکھنے جس کے لکھنے کی خواہش پہلے ظاہر فرما چکے تھے۔

خاص شیعہ کی طرز پر جتی اس کا جواب ہو سکتا ہے کہ بقول اُن کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلافت علی کے پہنچانے پر خاص مامور تھے اور آیت بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (جو کچھ تجھے خدا کی طرف سے حکم پہنچا ہے وُہ پہنچا دے) انہی معنی کے لیے نازل ہُوئی تھی کہ خلافت علی کی بابت تجھے حکم دیا گیا ہے وہ لوگوں کو پہنچا دے۔ اگر تو نے نہ پہنچایا تو گویا تو نے نبوت کی تبلیغ نہ کی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے روکنے سے حضور ایسے بڑے ضروری کام سے جس کا ارشاد جناب باری تعالیٰ سے پہنچا ہوا تھا جس کے نہ کرنے پر تمام نبوت کی تبلیغ کالعدم ہوتی تھی۔ آپ نے لکھوانے میں تساہل فرمایا۔ اگر اس موقع پر حضرت عمرؓ کی مخالفت مانع تھی تو صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی تو حضرت عمرؓ ہی صلح کے مخالف تھے بلکہ بڑے زور سے اس مخالفت کو نیک نیتی سے ظاہر کرتے اور پھیلاتے تھے مگر اُس نازک موقع پر جہاں ایک طرف کفار کا ہجوم ہے اور دوسری طرف خود صحابہ بھی رنجور دل بیٹھے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی مخالفت کی کچھ پروا نہ ہُوئی تو اس موقع پر جبکہ تمام حاضرین غلام ہیں۔ اہل بیت سب حاضر ہیں۔ عمرؓ کا اس قدر اثر ہُوا کہ حکم الٰہی کی تبلیغ سے خاموش ہو گئے۔ ہمارے خیال میں ایسا گمان نبوت میں بد گمانی پیدا کرنے کا موجب ہے۔

شیعوں کی طرف سے اس دعویٰ پر کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بابت حضورؐ نے خلافت کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس

کا مضمون یہ ہے کہ حضور نے فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ (یعنی جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب ایمانداروں کے مولا ہیں اس لیے حضرت علی بھی سب کے مولا ہیں، اور مولا کے معنی حاکم اور امیر کے بتلاتے ہیں، اسی حدیث کا تتمہ وہ الفاظ ہیں جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اکرم کی طرف سے روایت کیے جاتے ہیں کہ فرمان نبوی من کنت مولاہ الخ سن کر انہوں نے کہا تھا بخ بخ یا ابا الحسن اصبحت مولائی و مولا کل مؤمن و مؤمنۃ یعنی اے ابوالحسن علی مرتضیٰ تجھے مبارک ہو کہ تو میرا اور ہر ایماندار کا مولا ہو چکا۔ انتہی مختصراً۔

لیکن بغور دیکھا جائے تو اس سے شیعوں کا مدعا ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو حق خلافت تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ وغیرہ نے خلافت علی کو معاذ اللہ ظلم[1] سے غصب کیا جس کی وجہ سے وہ موردِ عتاب الٰہی

---

[1]: اسی نیت سے شیعہ وعظ و نصیحت کی مجالس میں اور دعا کرنے سے پہلے عموماً بعد حمد و صلوٰۃ کے اگر خالص شیعوں کی مجلس ہو تو صریح طور پر اصحاب ثلاثہ پر لعنت کرتے ہیں اور اگر مجلس ملی جلی ہو تو لعنۃ اللہ علی الظلمین کہا کرتے ہیں جس سے مراد ان کی بزعم خود اصحاب ثلاثہ ہوتے ہیں۔ اہل سنت کو ایسی لعنتیں سننے سے سخت رنج ہوتا ہے، مگر ایک حدیث ان کو تسلی دیتی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جو کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے اگر وہ لعنت کا حقدار نہیں ہوتا تو وہی لعنت لعنت کرنے والے پر ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی ہمارا بھائی سنی کسی مجلس میں شیعہ سے یہ کلمہ سن کر دل میں ناراض ہو تو وہ بھی اسی وزن کا لعنت اللہ علی الکذبین کہہ دیا کرے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد مگر در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست (منہ)

ہوں گے وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس حدیث میں جو مولا کا لفظ ہے، جس پر سارا مدار ہے اس کے معنی دوست اور محبت خالص کے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص اپنی ذات ستودہ صفات کی نسبت بھی فرمایا ہوا ہے لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین (یعنی جب تک میں سب چیزوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں اور مجھے تم اپنی اولاد اور ماں باپ اور تمام جہان کے لوگوں سے زیادہ پیارا نہ سمجھو گے مسلمان نہ ہو گے) نیز اسی حدیث من کنت مولاہ الخ کے اخیر میں بروایت امام احمد، ابو یعلی اور طبرانی یہ الفاظ بھی ہیں اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ یعنی حضور نے بعد فرمانے من کنت مولاہ الخ کے یہ بھی فرمایا کہ اے اللہ! جو علی سے محبت کرے اس سے تو محبت کر اور جو اس سے عداوت رکھے، تو بھی اس سے دشمنی کر اور اس کو مبغوض رکھ۔"

اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے متعلق وصیت نہ فرمائی تھی بلکہ اخلاص اور محبت کے متعلق تھی جو ہم کو بھی منظور ہے کیونکہ موالات کے مقابلہ میں آپ نے معادات کا لفظ فرمایا ہے، پس جو اس مقابلے کا مفہوم ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ حضرت علیؓ سے عداوت رکھنے والے خدا تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں جس پر ہمارا بھی صاد ہے۔

اس سے بڑھ کر ذوی قربہ بلکہ دلیل ان معنی کی کہ آنحضرت علیہ السلام کی مراد ان الفاظ سے صرف وصیت محبت تھی نہ وصیت خلافت - واقعہ بیعت ابوبکر صدیقؓ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول خدا فداہ ابی و امی کے انتقال فرماتے

ہی انصارِ مدینہ نے ایک الگ مجلس منعقد کر کے امیر بنانے کی تجویز کی جس پر ابوبکر صدیق رض اور عمر فاروق رض یہ خبر سنتے ہی مع ابُو عبیدہ رض ابن الجراح کے وہاں بر سرِ موقع پہنچے، دیکھا کہ مباحثہ گرم ہے انصار کا ارادہ ہے کہ اہلِ مدینہ میں سے امیر مقرر ہو، ان صاحبوں کے سوال وجواب کرنے کرانے پر آخر انھوں نے یہ بھی کہا کہ منا امیر و منکم امیر یعنی ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے، جس پر حضرت ابوبکر رض نے حدیث نبوی پیش کی الائمۃ من القریش یعنی امارت و امامت قریش ہی میں ہے، جب سب انصار کے روبرو حضرت ابوبکر رض نے یہ دلیل پیش کی تو کسی کو اس سے انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت ابُوبکر صدیق خلیفہ مقرر ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابُوبکر صدیق رض نے انصار کے مقابلہ پر حدیث پیش کر کے اُن کے دعویٰ کو توڑا، اُسی طرح کسی صحابی نے انصار سے یا مہاجرین سے بلکہ اہل بیت میں سے یہ حدیث کیوں پیش نہ کی کہ آپ یُونہی خلیفہ بنائے گئے ہیں، حالانکہ آنحضرت نے علی مرتضیٰ رض کے لیے وصیت اور تاکید فرمائی ہوئی ہے اور آپ دونوں (ابوبکر رض اور عمر رض) صاحبوں نے علی رض سے بیعت خلافت حضرت کی زندگی میں کی ہوئی ہے بلکہ مبارکبادیاں بھی دی ہوئی ہیں، پھر آپ کا کیا منصب ہے کہ آپ خلافت کے مُدعی ہوں اور تو اور ائمہ اہل بیت اور خاندان بنی ہاشم نے بھی اس دلیل کو معلوم نہیں کیوں پیش نہ کیا، حالانکہ ایسی قوی دلیل تھی کہ اس دلیل کے سامنے کسی کی چون وچرا چل ہی نہ سکتی کیونکہ ہزاروں آدمی اس کے گواہ موجود تھے لیکن جب حضرت علی مرتضیٰ اور دیگر ائمہ ہادی اور خاندان بنی ہاشم بلکہ مہاجرین و انصار میں سے کسی نے یہ حدیث اور واقعہ غدیر کو ابوبکر کی خلافت کے

خلافت بلکہ بعد خلافتِ صدیقی کے عمر فاروق رضؓ کی خلافت کے وقت بلکہ بعد ازاں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے وقت بھی پیش نہ کیا، جبکہ کوئی امر مشکل نہ تھا، صرف عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے پر فیصلہ موقوف تھا، اور بالکل الگ ایک دکیبٹی گھر) میں صرف تینوں صاحب (عبدالرحمٰنؓ، عثمانؓ، علیؓ) بیٹھے ہوئے تھے اس حدیث کا پیش کرنا کیا مشکل تھا۔ پس جبکہ کسی نے بھی اس حدیث سے استدلال نہیں کیا، نہ کسی اپنے نے نہ بیگانے نے، مہاجرین نے نہ انصار نے بلکہ نہ خود علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین نے، تو معلوم ہوا کہ سب صحابہ رضؓ مع اہل بیت اس حدیث من کنت مولاہ الخ سے یہی معنی سمجھتے تھے جو ہم نے بیان کیے، نہ وہ جو شیعہ کا گمان ہے۔

اس مختصر سی تقریر سے شیعوں کی کل روایتوں کا جواب ہو سکتا ہے جو اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا کرتے ہیں جن میں سے بعض میں حضرت علیؓ کی نسبت امیر المومنین کا لفظ بھی آتا ہے کیونکہ اس دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ روایات غلط ہیں یا ماوّل۔ اسی تقریر سے حضرت عمر فاروق و عثمان ذوالنورین و علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ خلافت کا مدار اس بات پر ہے کہ رعایا میں صلحا لوگ خلیفہ کو منتخب کریں، یا خلیفہ خود اپنے نائب کو انتخاب کر جائے اور بعد اس کے لوگ اس سے بیعت کریں، چنانچہ حضرت فاروق خلیفہ اوّل کے انتخاب سے خلیفہ ہوئے تھے، اور باقی دونوں صاحب رعایا کے انتخاب سے۔ مگر چونکہ اصل بحث سُنّی شیعہ صرف اس امر پر ہے کہ حضرت علی ہی کا حق خلافت تھا جو ابوبکرؓ وغیرہ نے معاذ اللہ غصب کیا یا ابوبکرؓ بھی خلیفہ برحق تھے، اس واسطے ہم نے

اس جگہ مختصر طور سے اس امر پر بحث کی ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ بلا فصل نہ تھے بلکہ جو کچھ ہوا یہی حق تھا۔ واعلم عند اللہ

وراثت انبیاء علیہم السلام

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت اُن کی اولاد اور دیگر ورثا کی طرف منتقل نہیں ہوتی، بلکہ مثل صدقہ اور وقف مال کے ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ خلافت کے مسئلہ کے بعد سُنیوں اور شیعوں میں معرکۃ الآرا ہے، مگر ہم خدا کے فضل سے اس کو ایسی عمدگی سے حل کریں گے کہ بایدوشاید، ہمارے نزدیک شیعوں نے اپنی کتابوں اور روایتوں کی بھی پروا نہیں کی اور ناحق اس مسئلہ کی آڑ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین سے بدگمان ہو گئے، کچھ تو خلافت کی آڑ میں کچھ اس مسئلہ کی بنیاد میں یہ لوگ جملہ اصحاب کو عموماً اور صدیقؓ کے دشمنوں کو خصوصاً ایسے الفاظ و القاب سے یاد کیا کرتے ہیں کہ کسی ایماندار کو تو کیا۔ کسی بھلے مانس آدمی کے لیے بھی شایان نہ ہوں۔ خیر اُن الفاظ کا دُہرانا یا اُن کا عوض لینا تو ہمارے رسالہ کے موضوع سے اجنبی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے رسالہ کے ناظرین میں سے کسی ایک کی بھی ہمارے طرز مضمون سے دل آزاری ہو۔ اس لیے ہم اپنے بھائیوں کے ظلم کا شکوہ اظہار نہیں کرتے، اس مسئلہ میں چونکہ ہمارا رُوئے سخن خاص شیعوں سے ہے اس لیے ہم ایک روایت اپنی اور ایک دو روایتیں اُن کی بیان کریں گے۔

ہماری روایت اس دعویٰ پر صحیح بخاری کی حدیث ہے جس کا مضمون ہے کہ:

قال ابوبکر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں

ما ترکنا صدقۃ (بخاری۔ کتاب الفرائض) وہ صدقہ ہوتا ہے۔

شیعوں کی حدیث اس بارے میں ہمارے پاس اصول کلینی[۱] کی (جو شیعوں کی مستند کتاب ہے) روایت موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

عن ابی عبد اللہ قال ان العلماء ورثۃ الانبیاء وذلک ان الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینارا و انما اورثوا احادیث من احادیثھم فمن اخذ بشیئ منھا اخذ حظا وافرا (اصول کلینی۔ کتاب العلم)	علماء انبیاء کے وارث ہیں اس لیے کہ انبیاء اپنی وراثت میں درہم و دینار نہیں چھوڑا کرتے، بلکہ صرف علم کی باتیں چھوڑ جاتے ہیں، پس جو شخص اُن علمی باتوں میں سے کچھ حصہ لیتا ہے، وہ بہت بڑا حصہ لیتا ہے۔

پس ان دونوں متفقہ روایتوں سے جو امر ثابت ہوتا ہے وہی اہلحدیث کا مذہب ہے، میں نے اس روایت کو بعض مشاہیر شیعہ علماء کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن تعجب ہے کہ جو جواب انہوں نے دیا اُس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے بیان سے پہلے اس روایت سے اُن کے کان آشنا ہی نہ تھے، آخر انہوں نے کہا کہ ایسے مسائل کا فیصلہ امام مہدی علیہ السلام ہی کریں گے، جس پر میں نے عرض کیا، بہت خوب! چشم ما روشن دل ماشاد۔

چونکہ یہ مضمون دونوں گروہوں کی صحیح حدیثوں سے ثابت ہے اس لیے

---

[۱]: یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے ہے۔ اصول کلینی میں آتی ہے اس لیے ہم نے مرفوع کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ (منہ)

جو سوال اس پر وارد ہوگا، اُس کے جواب وہ دونوں گروہ ہوں گے، پس اگر جواب سوالات آئندہ اٹھانے کو کافی نہ ہوں تو شیعہ ہی کوئی جواب دیں کیونکہ بموجب روایت کلینی اُن کا اور ہمارا مذہب اس مسئلہ میں ایک ہی ہے یا ایک ہی ہونا چاہیے۔

ایک سوال اس پر یہ ہے کہ خداوند کریم نے قرآن شریف میں تمام ایمانداروں کو خطاب کر کے فرمایا یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ الایۃ یعنی خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکی کی نسبت لڑکے کا دُگنا حصہ ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کے خطاب سرور عالم فداہ ابی و اُمّی کو بھی شامل ہوتے ہیں پس آیت قرآنی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو بھی تمام مسلمانوں کی طرح وراثت ملنی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت موصوف عام مخصوص البعض ہے یعنی جس قدر اس کا عموم ظاہر میں معلوم ہو رہا ہے اتنا مراد نہیں بلکہ اُس میں سے بعض اقسام دونوں گروہوں (سُنّی شیعہ) کے نزدیک اس حکم سے باوجود شمول آیت کے خارج ہیں، چنانچہ حاشیہ پر ہم نے دونوں گروہوں کی کتب وراثت سے عبارت نقل کی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ :-

المانع من الارث اربعۃ الرق وافرا کان اوناقصا والقتل الذی یتعلق بہا وجوب القصاص اوالکفارۃ واختلاف الدینین واختلاف الدارین اما حقیقۃ کالحربی والذمی اوحکما کالمستامن والحربیین من دارین مختلفین (سراجی و شرائع فی الاسلام)

غلام خواہ مسلمان ہو اور باپ کا قاتل اور مسلمان باپ کا کافر بیٹا وغیرہ ذلک

باپ کے وارث نہ ہوں گے"۔

حالانکہ آیتِ مرقومہ میں عام حکم ہے۔ پس جس طرح یہ اقسام آیت سے باوجود شمول کے خارج از حکم ہیں اسی طرح آنحضرت کے ورثاء بھی خارج ہیں کیونکہ انبیاء کی اولاد وارث مال نہیں ہوتی۔

دوسرا شبہ اس مضمون پر اس آیت سے کیا جاتا ہے جس میں حضرت داؤدؑ کی وراثت سلیمانؑ تک پہنچنے کا ذکر ہے یعنی ورث سلیمان داؤد پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت داؤد علیہ السلام سے وراثت پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثاء (حضرت فاطمہ وغیرہ) کیوں وارث نہ سمجھے جائیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو وراثت علمی ملی تھی یعنی نبوت اور حکومت میں حضرت سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے تھے، نہ کہ مال و اسباب میں، علمی وراثت کے تو ہم بھی معتقد ہیں۔ اختلاف تو مالی وراثت میں ہے، اگر مالی وراثت مراد ہوتی تو اس کا ذکر ہی کیا ضروری تھا، جب حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کے بیٹے تھے تو اُن کے وارث ہونے میں اشتباہ ہی کیا تھا، جس کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔ نیز حضرت داؤد کے اور بیٹے بھی تو تھے پھر بالخصوص حضرت سلیمان کو وراثت مالی کیسے پہنچ گئی اور دوسرے محروم کیے گئے۔ ان وجوہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی علمی وراثت حضرت سلیمان تک پہنچی تھی نہ کہ مالی۔ پس ہمارا مذہب بروایت سُنّی اور شیعہ دونوں گروہوں کے معتبر کتابوں سے ثابت ہو گیا۔ مزید تفصیل اس مسئلہ کی جلد ثانی تفسیر ثنائی حاشیہ نمبر ۸ میں دیکھو۔

اتباعِ سنّت اور اجتناب بدعت

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ ہر مذہبی کام میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع فرض ہے، سرِ مُو اس سے کمی بیشی جائز نہیں، جس کام کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود کیا ہو اور نہ کرنے کی اجازت فرمائی ہو، نہ اصولاً نہ فروعاً۔ وہ بدعت ہے، خواہ اس کا شیوع اس وقت تمام عالم میں ہو، خواہ حرمین شریفین زادھما اللہ شرفا وکراما میں ہو۔ خواہ اس کے موجد ہندی ہوں یا حجازی۔ عربی ہوں یا عجمی، گو اس مسئلہ پر مسلمانوں کے رد و بدو دلیل پیش کرنی کچھ ضروری نہیں، مگر مسلمانوں کی خوش قسمتی سے جہاں مسئلہ توحید اُن میں مختلف فیہ ہو رہا ہے۔ اتباعِ سنّت بھی معرکۃ الآرا بن رہا ہے۔ اس سبب محض اپنے مدعا کے ثبوت کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

قرآن شریف میں تو کئی ایک آیات ہیں جن کا صریح حکم ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی چال اختیار کرو بلکہ یوں کہیے کہ تمام قرآن شریف اسی ہدایت سے بھرا پڑا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے کہ :-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۔ (سورۃ الاحزاب ع)	جو لوگ خدا پر اور پچھلے دن (قیامت) پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کا بہت ذکر کرتے ہیں اُن کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک عمدہ نقشہ ہے۔

احادیث بھی ان معنی کی کثرت سے ہیں۔ ایک حدیث کا مضمون ہے کہ :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	پیغمبر خدا نے فرمایا جو کوئی ہمارے دین میں

من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منہ فھو رد (متفق علیہ)

ایسی کوئی نئی بات پیدا کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ عمل خدا کی جناب میں مردود ہے۔

قرآن شریف کا صریح حکم ہے کہ :۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (سورۃ النساء ع ۹)

جب تک لوگ ہر مذہبی بات میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ ہوں گے کبھی مسلمان نہ بن سکیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کو اتباعِ سنت کا اہتمام سب سے زیادہ تھا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ جیسے بزرگ بھی یہی خواہش بلکہ آرزو کرتے تھے کہ اشاعتِ سنت کی جاوے چنانچہ فرماتے ہیں :

"الحال آرزوئے نماندہ است الا آنکہ احیاء سنت از سننِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات نمودہ آید (مکتوبات جلد اول مکتوب ۳۷)"

پھر اسی جلد کے مکتوب ۲۹ میں شیخ درویش کو ارقام فرماتے ہیں :۔

"بہترین مصقلہا از برائے زدودن زنگ محبت ما دون حق سبحانہ از برائے حقیقت جامعہ قلبیہ متابعت سنت است"

ایسا ہی مولانا محبوب سبحانی حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ بھی اتباعِ سنت کی تاکید میں فرماتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ :۔

واجعل الکتاب والسنۃ اما مک وانظر فیھما واعمل بھما ولا تغتر بالقال والقیل والھوس قال اللہ

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو اپنا امام بنا اور اس پر غور وفکر کر اور ان کے مطابق عمل کیا کر اور ادھر ادھر کی قیل وقال اور

تعالیٰ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ
مَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ
اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ واتقوا
الله ولا تخالفوه فتترکوا
العمل بما جاء به وتخترعوا
لانفسکم عملا وعبادة کما
قال الله جل وعلا فی حق قوم
ضلوا عن سواء السبیل وَ
رَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا کَتَبْنٰهَا
عَلَیْهِمْ ثُمَّ انه ذکی نبیه
علیه السلام ونزهه من الباطل
فقال وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ای ما
اتیکم به من عندی لا من
هواه ونفسه فاتبعوه ثم قال
قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ فبین ان
طریق المحبة اتباعه صلی الله
علیه وسلم قولا وفعلا۔

بیہودہ ہوس سے دھوکہ نہ کھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا
ہے جو تم کو رسول دیوے وہ مضبوط پکڑو اور جس
سے منع فرمائے اس سے ہٹ رہو اور اللہ
سے ڈرتے رہو بیشک اللہ بڑے سخت عذاب
والا ہے، اللہ سے ڈرو اور اس کی مخالفت نہ
کرو ایسی کہ جو تعلیم اُس کا رسول تمہارے پاس
لایا ہے اُسے چھوڑ کر اور قسم کی عبادتیں اپنی طرف
سے نکالنے لگ جاؤ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے گمراہ
قوم عیسائیوں کے حق میں فرمایا ہے انہوں نے
رہبانیت کی بدعت نکالی جو ہم نے اُن پر لکھی نہ تھی،
پھر اپنے رسول علیہ السلام کی پاکی بیان کی اور باطل
سے اس کا الگ ہونا بتلایا۔ چنانچہ فرمایا کہ ہمارا رسول
اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا بول تو ہماری
وحی ہے یعنی جو کچھ وہ تمہارے پاس لایا ہے وہ
میرے پاس سے لایا ہے نہ کہ اپنی خواہش سے
اس نے بنایا ہے پس اس کا اتباع کرو پھر خدا نے
فرمایا اے رسول علیہ السلام تو ان سے کہہ کہ اگر
تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ
تم سے محبت کرے گا۔ پس صاف بتلا دیا کہ اللہ کی محبت

(فتوح الغیب مقالہ ۳۶)   کا طریق اس کے رسول کا اتباع ہے قول و فعل میں۔

حضرت موصوف نے نہ صرف اتباعِ سنت کی تاکید فرمائی ہے بلکہ اس بات سے بھی ڈرایا ہے کہ کوئی کام از قسم عبادات ایسا نہ نکالنا چاہیے جو سنت نبویہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اہلحدیث قبروں پر عُرس کرنے کو بدعت جانتے ہیں (بشرطیکہ کسی قسم کی استمداد و استعانت اہلِ قبور سے نہ ہو ورنہ شرک ہو جائے گا) اور آج کل رسمی مولود کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے اور نہ ہی جس طریق سے کی جاتی ہیں ان کو باعثِ ثواب یا مطابقِ سنت جانتے ہیں اس لیے کہ زمانہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں اس ہیئت کی مجلسیں نہ ہوتی تھیں اور نہ ہی آنحضرت ؐ نے اپنے تولد کے ذکر پر قیام کا حکم دیا اور نہ صحابہ کرام نے کیا، بلکہ ائمہ اربعہ کے زمانہ میں بھی اس کا رواج نہیں ہوا، اس کے جواب میں ہمیں طرح طرح کی باتیں سُنائی جاتی ہیں جن سے صاف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے بھائی ہمارا مطلب نہیں سمجھتے، اس لیے ہم نے حضرت پیرانِ پیر کی عبارت نقل کی ہے، پس جو کچھ اس عبارت سے مفہوم ہے وُہی اہلحدیث کا مذہب ہے۔ ایسی مجالس کے انعقاد کی بابت ہم سے کہا جاتا ہے کہ مطلق ذکرِ الٰہی جب شرع میں ثابت ہے تو مجلسِ مولود میں کیا قباحت ہے۔ یہ بھی ذکر اللہ ہی کی مجلس ہے، قیام کی بابت خدا نے فرمایا ہے لِتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ یعنی مسلمانو! تم رسولِ پاک کی تعظیم و تکریم کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تولد کے ذکر پر کھڑا ہونا حضرت کی تعظیم ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبکہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ہر طرح ذکر الٰہی جائز ہے تو پھر کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے میں کیا حرج ہے۔

ان سب اُمور کا جواب یہ ہے کہ گو (بالفرض) مجلس مولود میں تمام ذکر ہی

ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اس قسم کی مجلسیں نہ زمانہ رسولِ پاک میں اور نہ زمانہ صحابہ میں منعقد ہوتی تھیں، اس لیے سنّت نہیں ہو سکتیں، اور نہ اس قسم کی تعظیم حضور نے سکھائی اور نہ صحابہ نے کی جو حضور کی سب سے زیادہ تعظیم کرنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام تعظیم کی قسم سے نہیں بلکہ بدعت ہے، اس کے علاوہ اس کے مجلس مولود کا سراسر ذکرِ الٰہی ہی پہ مشتمل ہونا صحیح نہیں بلکہ اس کا ایک جزوِ اعظم قیام ہے جس کی کوئی سند اور اصل شرع میں نہیں، بیشک کتاب اللہ میں کھڑے بیٹھے لیٹے سب طرح ذکر کی اجازت بلکہ حکم ہے مگر یہ تو نہیں کہ ایک حالت پر ذکر کر رہے ہو تو ایک خاص موقع پر پہنچ کر اُس حالت سے دُوسری حالت کو انتقال کر جاؤ۔ اس انتقال کی اگر کوئی وجہ شرعی ہے تو وہ بتلاؤ ورنہ بلا وجہ شرعی کسی کام کو موجب ثواب جاننا بھی بدعت ہوتا ہے۔ یعنی جس کام کو شریعت نے ثواب نہ کہا ہو اُسے ثواب سمجھنا یہی بدعت ہے پس بوقت ذکر ولادت سرورِ کائنات قیام میں دست بستہ ہو جانا کہاں سے ثابت ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جس نیّت سے کھڑے ہوتے ہیں وُہ بھی خاص غور طلب ہے، اُس وقت کھڑے ہونے والوں کی نیّت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح پُر فتوح اس مجلس میں آئی ہے چنانچہ اس وقت سب کے سب درود بصیغہ مخاطب دست بستہ (الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ) پڑھنے لگ جاتے ہیں، یہ نیّت اور خیال سراسر حاضر ناظر جاننے کے برابر ہے جو صریح شرک ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

پس جبکہ مولود میں جزوِ اعظم قیام ہے اور وُہ بالکل بے ثبوت امر ہے جس کو ثواب سمجھا جاتا ہے، تو مجموعہ مجلس میلاد جو ایسے جزو بے ثبوت بلکہ بدعت پہ مشتمل ہے اگر

اُس میں اور کچھ بھی خرابی نہ ہو تو یہی خرابی بہت ہے کہ اس کا جزُ اعظم بدعت بلکہ بعض وجوہ اور فاعلین کی نسبت سے شرک ہے۔ تعجب ہے کہ بعض علماءؔ[1] اس قیام کو بے ثبوت تو مانتے ہیں مگر پھر بھی بایں لحاظ کہ حرمین شریفین کے علماء کرتے ہیں اس کو بدعت کہنے سے خاموش رہتے ہیں، بلکہ اس کے مستحسن ہونے کے قائل ہو جاتے ہیں حالانکہ خدا کی کتاب صاف ناطق ہے کہ مسائلِ شرعیہ میں کسی شخص کو منصبِ شریعت نہیں ہر ایک اُمتی کا یہی منصب ہے کہ پیغمبر علیہ السّلام کی چال چلے۔ حرمین شریفین والے بھی اُسی طرح شریعت کے مکلف اور مخاطب ہیں جس طرح ہند اور سندھ والے، ایسے ہی موانع کے لیے صاف ارشاد ہے کہ :-

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ	خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت پر چلو اور
وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ۔	اس کے سوا اور دستوں کی بات نہ
(سورۂ اعراف ع ۱)	مانو۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حرمین شریفین کے علماء کا اجماع حجّت نہیں مانا۔ چنانچہ اصولِ فقہ کی ہر ایک کتاب میں یہ مسئلہ مصرّح ہے۔ پس اگر کسی متبرک مقام کے لوگ کوئی فعل کریں اور اس کا ثبوت شرع سے نہ دے سکیں تو وہ بھی ہمارے مخاطب ویسے ہی ہیں جیسے ہندی اور سندھی۔ ہم بہ تعلیم قرآن و حدیث کسی اُمتی شخص میں یہ قابلیت نہیں مانتے کہ اس کا قول و فعل بلا دلیل شرعی سند اور حجّت ہو، یہی مذہب علماء سلف کا ہے کہ بغیر اجازت شرعی کے وہ کوئی کام

---

[1] : جناب مولوی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی لاہوری۔ دیکھو فتوی مندرجہ کتاب رحمۃ للعالمین مطبوعہ چشمۂ نور امرتسر۔

نہیں کرتے تھے۔ دیکھو تو درود شریف کا پڑھنا جو بموجب تعلیم قرآن و حدیث سراسر موجب برکت ہے بعض جگہ اسی درود کے پڑھنے سے سب علمائے سلف نے منع فرمایا ہے مثلاً نماز کے پہلے قعدہ (التحیات) میں اگر درود کا ایک جملہ بھی پڑھ لے گا، تو سجدہ سہو لازم آ جائے گا۔ حالانکہ قرآن و حدیث سے درود پڑھنے کی فضیلتیں بے انتہا ثابت ہیں، پھر کیوں سجدہ سہو لازم آیا؟ صرف اس لیے کہ بے اجازت شرع پڑھا گیا۔ شیخ سعدی مرحوم نے کیا ہی سچ فرمایا ہے:

ع نہ بے حکم شرع آب خوردن خطاست
اگر خوں بفتویٰ بریزی رواست

یہی وجہ ہے کہ علماء محققین حنفیہ بھی مولود کی مجلسوں کو بدعت جانتے ہیں منجملہ ان کے علماء گنگوہ۔ سہارنپور۔ دیوبند۔ مراد آباد۔ امروہہ۔ علماء دہلی۔ لکھنؤ۔ راولپنڈی[1] وغیرہ حنفیہ کرام میں سے اس کے بدعت ہونے کے قائل ہیں۔ غرض مختصر یہ کہ اہلحدیث کسی امر کو بغیر اطلاع شرعی کے موجب ثواب نہیں جانتے، ان کے اس خیال پر بعض سادہ لوحوں کی طرف سے ان گنت سوال ہوتے ہیں گو دراصل وہ سوال ہی اپنے جواب ہیں اور سائل کی بے سمجھی اور لاعلمی پر بیّن دلالت کرتے ہیں مگر بعض لوگ ایسے سائلوں سے بھی سادہ لوحی میں بڑھے ہوتے ہیں اُن کے سمجھانے کو ایسے سوالوں کے جوابات ہم ذکر تے ہیں :۔

پہلا سوال جس کو بہت بڑی رنگ آمیزی سے بیان کیا جاتا ہے یہ ہے کہ

[1]: ضلع راولپنڈی کے علماء سے مراد مولانا حضرت دین محمد المعروف ملّا صاحب ہیں۔ ہمارے شہر امرتسر کے علماء حنفیہ جن کے خادم ہیں۔ حضرت موصوف کا فتویٰ ہمارے پاس موجود ہے۔

تم (اہلحدیث) قرآن شریف کا ترجمہ دیسی زبان میں کیوں کرتے اور پڑھتے ہو کس حدیث میں آیا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ اُردو۔ فارسی۔ پنجابی زبانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے یا کوئی تفسیر عجمی زبان میں لکھی یا لکھائی ہو، اس کا جواب مختصر تو یہی ہے کہ "تو آشنائے حقیقت نئی خطا ایں جاست" اُردو فارسی وغیرہ میں قرآن شریف سمجھنے کی اجازت بلکہ حکم صاف خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ (س ۲۳ ص ع ۳)

ہم نے یہ بابرکت کتاب اسی لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس کے حکموں پر غور کریں اور عقلمند اس سے نصیحت پاویں۔

پس جب قرآن مجید کا نزول ہی ہمارے تدبّر اور سمجھنے کے لیے ہے تو دیسی زبان میں ترجمہ کیے بغیر ہم کیونکہ سمجھ یا سمجھا سکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ بعض احکام شریعت میں بطور اصل مقصود کے قرار دیے جاتے ہیں لیکن اُن کے ذرائع پر نظر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ مناسب حال اور لائق مقام ذریعہ اُن کے حصول کا بن سکے بنا لیا جاتا ہے، مثلاً جہاد یا حج وغیرہ کے سفر کو جانا تو شرع میں ثابت ہے، مگر اس امر کی خصوصیت نہیں کہ کس سواری کے ذریعے سے سفر ہو۔ اُونٹوں کے ذریعہ یا گھوڑوں کے ایکے سے یا ریل سے کیونکہ یہ سب اسباب ہیں جو مناسب حال ہو اُسے برت لینا چاہیے، ایسا ہی شریعت میں کفار کے غلبہ اور مزاحمت فی الدین کے وقت جہاد کرنے کا حکم ہے، مگر اس امر کی کوئی خصوصیت نہیں کہ نیزوں سے ہو یا تلواروں سے، جو زمانہ پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم میں اسبابِ جنگ تھے، بلکہ مناسب حال جو ہتھیار ملے بندوق ہو یا توپ، نیزہ ہو یا تلوار۔ اسی طرح فہم مطالبِ قرآنی کو سمجھنا چاہیے کہ اصل مطلب قرآن شریف کا سمجھنا ہے اُس کے ذرائع کی تخصیص نہیں علیٰ ہذا القیاس اور بھی جتنے کچھ اعتراضات ہیں اسی قسم میں پس اُن سب کے جوابات اسی اصول سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔

مولود شریف اس قسم سے نہیں کیونکہ وہ (بقول حامیانِ مولود) ذکر ہے اور ذکر کی بابت خاص ارشاد ہے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (خدا کا ذکر کرو مگر اُس طریق سے کرو جو طریق اُس نے تم کو سکھایا ہے اُس سے پہلے (بھی تو تم گمراہ تھے) پس جس طرح اور جس طریق سے شریعت مطہرہ نے ہمیں ذکر کرنا سکھایا ہے اُسی طریق سے ہم کریں گے تو ثواب کے مستحق ہوں گے ورنہ نہیں۔

قبور پر عرس وغیرہ کرنے سے تو صاف منع فرمایا ہے۔ فوت ہونے کے وقت آخری وصیت حضورؐ نے یہی فرمائی تھی کہ لا تجعلوا قبری عیدا لا تجعلوا قبری وثنا یعبد (میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا۔ میری قبر کو بُت کے مانند معبود نہ بنانا) یہی وجہ ہے کہ حامیانِ عرس ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتلا سکتے کہ سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ افضل التحیۃ والصلوٰۃ کے انتقال کے بعد صحابہ کرامؓ نے باوجود اُس محبت خالصہ کے جس کا عشرِ عشیر تو کیا ہزارواں حصہ بھی حامیانِ عرس کو اُن بزرگوں سے نہ ہو گا جن کی قبروں پر عرس کرتے ہیں کبھی ایک دفعہ بھی مزار مقدس پر عرس کیا ہو، پھر ہمارے لیے کیسی شرم کی بات ہے کہ جو کام نہ تو رسولِ پاک نے

اپنے حق میں فرمایا ہو، نہ صحابہ کرامؓ نے حضورؐ سے وہ معاملہ کیا۔ وہ ہم اولیاء اللہ اور اُن کے مزاروں سے کریں، یہ تو ابھی سرسری نظر محض عُرس کے اجتماع اور ازدحام پر ہے اور اگر اُن کے تفصیلی حالات دیکھے یا سُنے جائیں تو یُوں معلوم ہوگا کہ مکہ شریف زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً میں جس خرابی کی اصلاح کے لیے خدا نے سیّد الانبیاءؐ کو مبعوث فرمایا تھا، اس خرابی سے زائد نہ ہوگی۔ عموماً قبروں پر طواف کیے جاتے ہیں منّتیں مانی جاتی ہیں، سجدے اور رکوع قبروں پر کیے جاتے ہیں، خاکسار راقم کو اپنا چشم دید واقعہ یاد ہے، میں ایک دفعہ ایّام طالب علمی میں بغرضِ تحقیق اس امر کے دیوبند سے رڑکی پیرانِ کلیر کے مزار پر گیا۔ مزار کے گنبد کے اندر جاتے ہی میں نے ایک شخص کو سر بسجود دیکھا۔ دل میں بہت گھبرایا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ دریافت کیا تو جواب ملا کہ یہ شخص چراغ جلانے کیلئے ہر روز اسی طرح اجازت لیا کرتا ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ! عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ اتنے میں نمازِ مغرب کی اذان ہوئی بعد نماز تمام خدام نے مزار کے گرد طواف کرنا شروع کر دیا، پھر ایک پھیرے کے بعد ایک موقع پر پہنچ کر سب رکوع کرتے تھے، یہاں تک کہ اُنھوں نے سات طواف پورے کیے میں امام صاحب کی تاک میں تھا، وہ ایک خاص مقام پر دو زانو بیٹھے ہوئے تھے، بعد کچھ مدت کے انہوں نے قبر کی طرف سجدہ کر دیا۔ میں نے اُن کی یہ کیفیت دیکھ کر اپنی نماز کا تو اعادہ کیا اور غضب الٰہی کے خوف سے راتوں رات وہاں سے اُٹھ بھاگا۔ میرے اس بیان میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کمی ہو تو ہو۔ جس کسی کو شُبہ ہو وہ ایسے مزاروں پر عرس کے دنوں میں خود جا کر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے قبروں کی عالی شان عمارتیں جو اُن کے غلاف

جھاڑ اور قندیل وغیرہ سامانِ عشرت کے کیا کہنے۔ حالانکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو خاص اسی کام کے لیے مامور فرمایا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو اونچی قبر دیکھے اُس کو برابر کردے۔ جو تصویر دیکھے اُس کو مٹا دے۔ فقہائے حنفیہ نے بھی ایسی عمارت کو سخت ناپسند کیا ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ مالابدّ منہ میں فرماتے ہیں :-

"آنچہ بر قبور اولیاء عمارت ہائے رفیع بنا می کنند و چراغاں روشن می کنند و ازیں قبیل ہر چہ می کنند حرام است یا مکروہ۔"

اسی طرح تمام فقہائے حنفیہ نے اس پر ناراضگی فرمائی ہے: من شاء فلیرجع الی کتبھم

اہلحدیث کے اس بیان کے مقابل حامیانِ عرس وغیرہ آیت حدیث تو کیا ہی پیش کریں گے: ولن یفعلوا البتہ کسی نہ کسی غیر مستند صوفی و ولی کے اقوال و افعال کا ذکر کریں تو ممکن ہے۔ لیکن اہلحدیث و نیز کل علماء راسخین کے نزدیک ایسے استدلالات کے جوابات وہی ہیں جو شیخ سعدی مرحوم نے ایک ہی بیت میں ادا کر دیے ہیں کہ ؎

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نرہی　　این ست جوابش کہ جوابش ندہی

اہلحدیث کی یہی باتیں اور دلیلیں ہیں جن سے لاجواب ہو کر ہمارے بھائیوں کی طرف سے ان کے حق میں منکرینِ اولیاء کے القاب بخشے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کو بزرگوں سے بے اعتقادی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ایسی بے اعتقادی کے مقابلہ پر حامیانِ بدعات کی حسن اعتقادی بجوئے نیرزد (کوڑی کے کام کی نہیں)

نذر لغیر اللہ

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ جو چیز غیر اللہ کے لیے نذر کی جائے وہ حرام ہے، اس مسئلہ میں چونکہ اہلحدیث اپنے بھائیوں سے منفرد نہیں۔ بلکہ حنفیہ کرام کا بھی یہی مذہب ہے۔ فرق صرف تھوڑا سا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، اس لیے ہم یہاں پر نذر لغیر اللہ کے معنی اور تفصیل علماء دہلی کی عبارات میں بتلاتے ہیں۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی میں زیر آیت وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ فرماتے ہیں :-

"مگر وہ چیز کہ آواز دی گئی ہو حق اُس جانور میں واسطے غیر خدا کے خواہ تو وہ غیر بُت ہو یا روح خبیث جیسے بھوگ کا نام دیتے ہیں، اور خواہ کسی جن کے نام خواہ پیر و پیغمبر کے نام زندہ جانور نذر کر دیں کہ یہ سب حرام ہیں اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو شخص جانور کو واسطے تقرب غیر خدا کے ذبح کرے وہ شخص ملعون ہے اور وقت ذبح کے نام خدا لے یا نہ لے، اس واسطے کہ جب تہرت کر دی کہ یہ جانور فلانے کے واسطے ہے تو وقت ذبح کے خدا کا نام مفید نہ ہوگا اس واسطے کہ وہ جانور منسوب بغیر خدا ہو گیا اور اُس میں پلیدی پیدا ہو گئی اور خبث اُس کا مردار کے خبث سے زیادہ ہے۔ اس واسطے کہ مردار بغیر ذکر نام خدا کے مر گیا ہے اور یہ جانور غیر خدا کے نام پر مارا گیا ہے اور یہ عین شرک ہے اور جبکہ یہ خبث مؤثر ہوا تو ذکر نام خدا اس کو حلال نہیں کر سکتا جیسے کہ کتا و سور کہ نام خدا لے کر ذبح کیے جاویں، حلال نہ ہوں گے۔"

پھر اس شبہ کا جواب دیا ہے جو بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ کے معنی ہیں کہ جو چیز غیر خدا کے نام ذبح کی جائے یعنی اُس کے ذبح کرنے پر غیر کا نام لیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"اُھِلَّ کو ذُبِحَ پر حمل کرنا خلاف لغتِ عرب اور عرف ہے اہلال لغتِ عرب اور عرف اُس ملک میں بمعنی ذبح کے نہیں آیا ہے کسی شعر اور کسی عبارت میں پایا نہیں جاتا۔ بلکہ اہلال لغتِ عرب میں بمعنی آواز اور شہرت دینے کے ہے جیسے آواز طفلِ نو اور شہرت چاند اور بمعنی آواز حج اور اس کے سوا معنوں میں مستعمل ہے اگر کوئی کہے اَھْلَلْتُ لِلّٰہِ ہرگز بمعنی ذَبَحْتُ لِلّٰہِ نہ سمجھا جاوے گا تفسیر نیشاپوری میں کہا ہے کہ تمام علماء نے اجماع کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اور ارادہ ذبح سے تقرب الیٰ غیر اللہ رکھے تو وہ آدمی مرتد ہے اور اُس کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔"

مولانا نواب قطب الدین صاحب مرحوم نے مظاہر الحق جلد سوم باب الایمان والنذور میں اس سے بھی کسی قدر وضاحت سے لکھا ہے، فرماتے ہیں :۔

"حاصل یہ کہ جو کچھ کہ لوگ نذر بزرگوں کی از راہِ نزدیکی حاصل کرنے کے اُن سے یا اُوپر بر آنے ایک کام کے متعلق کر کے کرتے ہیں، بموجب روایات مذکورہ[1] الصدر کے وہ نذر ناجائز اور کھانا اُس کا نادرا

---

[1] : نواب صاحب نے اس بیان سے پہلے کئی ایک روایات فقہ حنفیہ نقل کی ہیں جن کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ (منہ)

ہے اور جو کچھ کہ نیاز اُن کی نہ بطور نزدیکی حاصل کرنے کی اُن سے اور نہ منفق ساتھ کسی کام کے کرتے ہیں بلکہ اوّل اس چیز کو ازراہ نزدیکی حاصل کرنے کے اللہ تعالیٰ سے دیتے ہیں اور ثواب اُس کا کسی بزرگ کو بخشتے ہیں، کھانا اس کا اغنیاء کو درصورتیکہ نیت پہنچانے ثواب صدقہ ماکولی کی کسی بزرگ کو ہو جائز نہیں۔"

پس جو کچھ ان دونوں بزرگوں کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے وہی اہلحدیث کا مذہب ہے یعنی اُن صدقات ونذرات کا دینے والا اگر اس خیال سے دیتا ہے کہ یہ بزرگ مجھے کچھ فائدہ پہنچائیں گے یا میری کوئی بلا ٹال دیں گے تو ایسے صدقات کا کھانا حرام ہے اور اُن صدقات کا قبول کرنے والا خدا کو جانے اور یہ نیت کرے کہ جو ثواب خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر مجھے ملے گا۔ وہ میں فلاں بزرگ کو اپنی طرف سے پہنچاتا ہوں تو یہ جائز ہے۔ یہاں تک تو ہمارے بھائیوں کا اور ہمارا اتفاق ہے لیکن تنقیح طلب بات صرف یہ ہے کہ آج کل جو صدقات خیرات اس قسم کے دیئے جاتے ہیں جن میں بزرگوں کا نام آتا ہے آیا وہ قسم اوّل سے ہیں یا دوم سے۔ پھر بعد تحقیق قرائن سے جو کچھ معلوم ہو گا فریقین کا اسی پر عمل ہو گا۔ اہلحدیث کی تحقیق میں جو بالکل قرائن صحیحہ بلکہ دلائلِ قویہ پر مبنی ہے کچھ شک نہیں، کہ ایسے صدقات دینے والوں کی نیت عموماً یہی ہوتی ہے کہ بزرگ ان کو قبول کر کے ہمیں کوئی فائدہ پہنچا دیں گے، یا ہم سے بلا ٹال دیں گے، اس کی قوی دلیل اور نشانی یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے صدقات وخیرات دیتے وقت عموماً ایسے ایسے ختمات پڑھتے ہیں جن میں صاف اور صریح لفظوں میں اُن بزرگوں سے دُعائیں اور التماس

کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے بعض الفاظ یہ ہیں :۔

ختم حضرت علیہ السلام

شیئاً للہ[۱] یا حضرت سیدالعرب دالعجم مشکل کشا بالخیر فرما دیا حضرت احمدا۔

[۱] : شیئاً للہ کے معنی ہیں کہ اے حضرت خدا کے لیے کچھ دیجیے " قطع نظر اس اجمال بلکہ اہمال کے کہ اس سوال سے کوئی معقول امر مفہوم نہیں ہوتا۔ یعنی نہیں سمجھا جاتا کہ سائل کیا چیز مانگتا ہے۔ اس لفظ کی بابت در مختار باب المرتد میں لکھا ہے۔ بعض فقہانے اس کو کلمہ کفر لکھا ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کی ہتک ہے، علاوہ اس سے یہ متکلم بھی حضرت شان صورت میں ہے کہ زندہ سے سوال ہو۔ لیکن جس صورت میں خطاب بھی فوت شدہ ہو سننا بھی نہیں۔ اس سے ایسا سوال کرنا تو دو وجہ سے کفر ہوگا۔ ایک وہ وجہ جو صاحب دُرمختار کی مراد ہے، دُوسری وہ وجہ جو خدا نے فرمائی ہے۔ یعنی إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ یعنی جن لوگوں سے تم دُعا کرتے ہو وُہ بھی تمہاری طرح آدمی ہیں جو تمہاری دُعا بھی نہیں سُن سکتے اور اگر سُنیں بھی تو قبول نہیں کر سکتے۔

ع در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

ایسے ختمات کے ناجائز بلکہ کفر اور شرک ہونے پر محققین علمار حنفیہ اہلحدیث سے متفق ہیں۔ چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور علماء دیوبند کا فتویٰ اس جگہ ہم درج کرتے ہیں، جو یہ ہے :۔

السوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین رحمہم اللہ کہ کسی بزرگ سے امداد طلب کرنا مثلاً یہ وظیفہ پڑھنا : سہ (باقی ملاحظہ ہو بر صفحہ ۵۶)

ختم حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خذیدی یا شاہ جیلان خذیدی شیئاً للہ انت نور احمد۔ خذیدی شیئاً للہ یا حضرت سلطان شیخ سید عبد القادر جیلانی محی الدین مشکل کشا بالخیر، امداد کن، امداد کن، از بندِ غم آزاد کن، در دین و دنیا شاد کن یا شیخ عبد القادرا۔

(بقیہ صفحہ ۵۵) امداد کن امداد کن از بندِ غم آزاد کن در دین و دنیا شاد کن یا شیخ عبد القادرا

یا کسی ولی اللہ کو مخاطب کر کے شیئاً للہ پڑھنا۔ مثلاً یوں کہنا

شیئاً للہ چوں گدائے مستمند المدد خواہم ز خواجہ نقشبند

یا یوں کہنا۔ شیئاً للہ چوں گدائے دلحزیں المدد خواہم ز خواجہ نوردیں

یا یوں کہنا۔ خذیدی یا شاہ جیلان خذیدی شیئاً للہ انت نورِ احمد۔

وغیرہ بھی اس قسم وظائف اور ختمات پڑھنے جائز ہیں یا منع بینوا توجروا

الجواب :۔ اس قسم کے وِرد وظائف اگر ان بزرگوں کو حاضر ناظر جان کر اور قادر و متصرف اعتقاد کر کے پڑھے جاویں تو صریح کفر اور محض شرک ہیں اور اگر اس اعتقاد سے نہ پڑھے جاویں صرف الفاظ و کلمات کی تاثیر و خاصیت کا اعتقاد ہو تب بھی گناہ ہے۔ فقط واللہ اعلم

بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

الجواب صحیح :۔ بندہ محمود عفی عنہ (مولانا محمود الحسن صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ دیوبند

الجواب صحیح :۔ بندہ مسکین محمد یسین عفی عنہ مدرس مدرسہ دیوبند

الجواب صحیح :۔ عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی مدرسہ

الجواب صحیح :۔ بندہ محمد مرتضیٰ حسن عفی عنہ مدرس مدرسہ دیوبند

الجواب صحیح :۔ احقر الزمان گل محمد خاں عفی عنہ مدرس مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند (مہر)

ختم حضرت نقشبند رحمۃ اللہ علیہ

شیئاً للہ چوں گدائے مستمند   المدد خواہم ز خواجہ نقشبند

ختم حضرت مخدوم صاحب مرحوم کشمیری

سلطان مرا خرم کند، سلطاں مرا بے غم کند، سلطاں بر آرد کارِ ما !

سلطاں بداند حالِ ما - آساں کند دشوارِ ما - یا شیخ حمزہ پیرِ ما !

ختم حضرت شیخ نورالدین مرحوم کشمیری

شیئاً للہ چوں گدائے دل حزیں   المدد خواہم ز شاہِ نوردیں

ختم حضرت امیر کبیر مرحوم کشمیری

شیئاً للہ یا حضرت شہنشاہ وَلی علی ثانی المدد

ان سے علاوہ کئی ایک قسم کے الفاظ ہیں جن کے ذریعہ سے اظہار مدعا کیا جاتا ہے، ناظرین مشتے نمونہ از خروارے انہی کو سمجھیں۔ پس یہ الفاظ اس بات کی صاف دلیل ہیں، کہ ان قائلوں کا خیال ہے کہ ان بزرگوں کو نفع و نقصان رسانی پر قدرت ہے۔ پس یہی دلیل اس بات کی ہے کہ ایسے صدقات دینے سے اُن کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ یہ بزرگ ہماری حاجت روائی کردیں گے چنانچہ الفاظ مذکورہ بالا کا صریح مضمون ہے، گو ان ختمات میں خدا کا ذکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھی پڑھتے ہیں۔ مگر صرف درود پڑھنے سے اس نیت کا عدم نہیں ہوسکتا، کیونکہ اِنّما الاعمال بالنّیات و انّما لکل امرءٍ ما نوی" یعنی ہر کام کا بدلہ نیت پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اُس نے نیت کی" پس جبکہ فاعلین کی نیت صاف اور صریح لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے تو اب کسی مولوی یا مُلّا کی اصلاح کہاں چل سکتی ہے؟

بلکہ نادیل الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ کی مصداق ہے۔ افسوس کہ ہمارے بھائی صرف اس خیال سے کہ ایک تو اس قسم کی دعوتوں سے محروم رہیں گے، نیز ان کے چھوڑنے سے لوگوں میں وہابی مشہور ہو جائیں گے۔ باوجود ایسے کلمات کو ناجائز اور ایسے کھانوں کو حرام جاننے کے پرہیز نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن شریف ایسی استمدادوں کا صریح رد کرتا ہے، بلکہ یوں سمجھیے کہ ایسی استمدادوں ہی کے رد کرنے کو قرآن مجید نازل ہوا تھا، اور جو اس قسم کے کھانوں کو کھلے لفظوں میں حرام بتلاتا ہے، اور تمام ائمہ دین اور علماء حنفیہ اعلام ان کی حرمت کے قائل ہیں مگر ہمارے بھائیوں کا یہ طریق ہے کہ ان کی مسجدوں میں ایک شخص تو سنت سمجھ کر آمین بالجہر کہہ دے اور دوسرا شخص بعد نماز گیارہ قیام یاد کر حضرت پیر سے التماس کرے جو صریح شرک ہے، تو بیچارے آمین کہنے والے کی تو گت ہو جائے گی مگر دوسرے کو کسی کی مجال کہ کچھ کہے، حالانکہ آمین اگر حنفی مذہب میں سنت نہیں تو حرام یا مفسد صلوٰۃ بھی نہیں۔ خاص کر دوسرے شخص کے حق میں تو کچھ بھی حرج نہیں، اکثر مجتہدین اور ائمہ حدیث اس کی سنیت کے قائل ہیں اور مخلوق سے دعا کرنی اور پھر مسجد میں بیٹھ کر کرنی صریح قرآن کے خلاف ہے، قرآن میں صاف حکم ہے کہ: وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (یعنی مسجدیں اللہ کے ذکر کے لیے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو بھی مت پکارنا) یہ ہے دونوں کا حکم اور یہ ہے ہمارے بھائیوں کا طریق عمل۔ الی اللہ المشتکی۔

تقلید شخصی اہلحدیث کا مذہب ہے کہ دین کے اصول چار ہیں قرآن[1]، حدیث[2]، اجماع امت[3]، قیاس مجتہد[4] سب سے مقدم قرآن شریف ہے،

پھر علی سبیل المراتب - قرآن وحدیث کے سمجھنے کے لیے علم لغت، قواعد صرف نحو، علم معانی، بیان، اصول، فقہ وغیرہ ذریعہ ہیں جو مسئلہ قرآن وحدیث سے بطریق مذکورہ ہماری سمجھ ناقص میں نہ مل سکے تو جس مسئلہ پر تمام اُمت کا اجماع ہوگا وہ قابلِ عمل ہے اور جو مسئلہ اس طرح بھی نہ مل سکے اُس میں کسی مجتہد کا قیاس (بشرائط اصولِ فقہ جن کا ذکر آگے آتا ہے، قابلِ عمل ہوگا)۔

ناظرین! یہ ہے وہ مسئلہ جس کی وجہ سے فرقہ اہلحدیث کے نام وہابی غیر مقلد۔ لامذہب وغیرہ وغیرہ رکھے جاتے ہیں جس کا ہمیں کوئی افسوس نہیں، کیونکہ جو خفگی اور ناراضگی کسی فریق پر بے سمجھی سے ہوتی ہے وہ درحقیقت اُس پر نہیں بلکہ خفا ہونے والے کی اپنی ہی ناقص سمجھ پر ہوتی ہے۔ ؎

کم من عائب قولا صحیحا[1] وآفتہ من الفہم السقیم

چونکہ یہی مسئلہ ہمارے اور ہمارے بھائیوں (مقلدین) میں حدِ فاصل ہے یعنی اسی مسئلہ پر دونوں گروہوں کی علیحدگی مبنی اور متفرع ہے اس لیے ہمارا خیال بلکہ حق تھا کہ ہم اس مسئلہ کو بڑی تفصیل سے لکھتے۔ مگر افسوس کہ اس مسئلہ کی بداہت اور ظہور ہمیں تطویل کلام سے مانع ہے لیکن تاہم اس دعویٰ پر کسی قدر قرآن و سنت اور مسئلہ اصول فقہ سے ثبوت دیا جاتا ہے۔

قرآن شریف میں صاف ارشاد ہے اِتَّبِعُوا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ یعنی خدا فرماتا ہے مسلمانو! جو کچھ تمہارے

[1] : (ترجمہ شعر) کئی لوگ صحیح باتوں پر بھی اعتراض کر دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی ناسمجھی کا نتیجہ ہوتا ہے (منہ)

پروردگار کی طرف سے تم کو ملا ہے اُسی کی تابعداری کرو اور اُس کے سوا مذہبی امور میں اور کسی کی تابعداری نہ کرو"۔

ایک مقام پر ارشاد ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اے ہمارے رسُول تُو ان سے کہہ دے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اِن کے علاوہ سینکڑوں آیتیں اس مضمون کی ہیں جن میں حصر کے ساتھ بتلایا گیا ہے کہ بس پیغمبر علیہ السلام کے سوا کسی کی اطاعت مت کرو۔ ایک حدیث بخاری میں ارشاد ہے لو كان موسىٰ حيا لما وسعه الا اتباعي یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میری ہی تابعداری کرتے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کی تابعداری کرنے لگ جاؤ تو گمراہ ہو جاؤ۔ چونکہ اصل اطاعت اور تابعداری خدا نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض کی ہے، اسی لیے علماء کو اجماع اور قیاس کے حجت ماننے میں شبہات پیدا ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض تو ان دونوں کی حجیت سے انکاری ہی ہو گئے اور بعض جو قائل ہیں انہوں نے اس کی وجہ بتلائی کہ اجماع بھی وُہی صحیح ہو گا جس کی بنا اور مدار کسی حدیث پر ہو۔ اور قیاس مجتہد بھی وہی صحیح ہو گا جو کسی آیت یا حدیث کے مخالف نہ ہو۔ بلکہ اُسی سے مستنبط ہو اس لیے کہ کل اصولی قاطبۃً شرائطِ قیاس میں یہ بھی لکھا کرتے ہیں کہ ان يتعدى الحكم الشرعي الثابت بالنص بعينه الى فرع هو نظيره ولا نص فيه (یعنی قیاس کی شرط یہ ہے کہ حکم شرعی بعینہٖ فرع (مقیس) کی طرف پہنچے جو اصل

(مفلس علیہ) کی مثل اور اُس میں دوسری کوئی نص نہ ہو دیکھو اصول شاشی حسامی نورالانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت وغیرہ) ان حوالجات کتب اصول سے جو امر مستنبط اور مفہوم ہوتا ہے۔ پس وہی ہمارا مذہب ہے یعنی جس مسئلہ میں آیت یا حدیث ہوگی اس میں مجتہد قیاس نہ کرے گا اور جس مجتہد کا قیاس کسی آیت یا حدیث کے خلاف نہ ہوگا اُسی پر عمل کریں گے اور جس کا قیاس بتقضا ئے بشریت خلاف ہوگا، اُسے متروک العمل جان کر عمل نہیں کریں گے، اس لیے کہ کسی مجتہد کو بنفسہٖ منصب شریعت نہیں یعنی وہ ایجادِ حکم نہیں کرسکتا، بلکہ مجتہد کا منصب صرف یہی ہے کہ کسی آیت یا حدیث سے ایک مخفی راز کو جو عوام کی سمجھ میں نہ آئے، ظاہر کر دے، اس کی مثال یہ سمجھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (الآیۃ) یعنی صبح کی دھاری نکلنے تک روزوں کی راتوں میں کھاتے رہو۔ اس آیت کا صریح اور صاف مضمون جو ہے وہ تو ظاہر ہے کہ صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔ مجتہد نے اس میں اجتہاد کرکے یہ مسئلہ نکالا کہ صبح ہونے وقت اگر آدمی جنبی ہو تو روزہ میں کوئی خلل نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب صبح صادق کے ظاہر ہونے تک کھانے پینے اور ایسا ہی جماع کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو صبح صادق کی پہلی آن میں جب اس حکم کے مطابق آدمی جماع سے الگ ہوگا تو ضرور جنبی ہوگا، کیونکہ اتنا وقت اس کو کہاں ملا کہ صبح صادق تک غسل کرے اس نے تو جماع ہی صبح کے ہونے پر چھوڑا ہے پس ثابت ہوا کہ رات کے جماع سے صبح تک جنبی رہنا

رد نہ دینے میں نقصان نہیں لانا۔

یہ ہے مثال اجتہاد کی۔ اس میں مجتہد نے اپنی طرف سے کوئی بات داخل نہیں کی، بلکہ ایک مخفی حکم کو واضح کر دیا ہے جو عوام کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔ علمائے اصول بھی قیاس کو اسی لیے صرف مظہر[۱] مانتے ہیں یعنی ایک مخفی مسئلہ کو ظاہر کر دینے والا اور بس۔ پس جب مجتہد کو اصل منصب شریعت نہیں تو پھر اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ مجتہد کے قول میں غلطی کا احتمال بھی ہے۔ چنانچہ علمائے اصول کا عام اصول ہے کہ المجتہد[۲] قد یصیب و قد یخطی (یعنی مجتہد کبھی اجتہاد کرتے میں مطلب صاف پا جاتا ہے اور کبھی غلطی بھی کر جاتا ہے) چنانچہ ائمہ مجتہدین کا اجتہادی مسائل میں اختلاف اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔ پس جب مجتہدین کی رایوں میں اختلاف ہوا اور یہ بھی اہل تحقیق کے نزدیک مسلّم امر ہے کہ ان میں سے خدا تعالیٰ کے نزدیک حق بجانب ایک ہی ہے تو نتیجہ صاف ہے کہ مجتہدین بنفسہٖ قابلیت متبوع بننے کی نہیں بلکہ بشرط موافقت و مطابقت اصل متبوع (یعنی قرآن و حدیث) کے۔ پس یہی ہمارا مذہب ہے کہ ہم بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی شخص کو متبوع نہیں مانتے۔ جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ ہم کسی مجتہد کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ہمارا عمل قرآن و حدیث پر ہے۔ جس مسئلہ کو ہم صحیح جانتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، جس کو غلط جانتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ قرآن و

[۱]: دیکھو نور الانوار صفحہ ۲۲۴ مطبوعہ انوار محمدی لکھنؤ

[۲]: " " " ۲۴۶ " " " "

حدیث سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ چنانچہ ائمہ مجتہدین خصوصًا امام ابُوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمایا ہے کہ اذا صح الحدیث فھو مذھبی یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ نیز فرمایا اترکوا قولی بخبر الرسول یعنی میرا قول پیغمبر علیہ السلام کی حدیث کے مقابلہ میں چھوڑ دیا کرو۔ اسی وصیت کے مطابق امام صاحب کے شاگردوں نے ہمیشہ عمل کیا یہی وجہ ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور بھی آپ کے کئی جلیل القدر تلامذہ (راوی) عمومًا مسائل میں وہ استاد سے مختلف ہیں اور اس اختلاف کو آج تک کسی نے بُری نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ متاخرین فقہا بسا اوقات بلحاظ قوتِ دلیل شاگردوں کے اقوال کو مفتیٰ بہ قرار دیتے ہیں جس کی تفصیل بتلانے کی حاجت نہیں۔ یہی تمام سلف و خلف کا مذہب تھا اور یہی اہلحدیث کا طریق ہے جن کو دل دُکھانے کے لیے وہابی یا غیر مقلد کہا جاتا ہے، ہاں اگر یہ سوال ہو کہ اس موافقت اور عدم موافقت کی پہچان کس کو ہے اور کون بتلا دے گا کہ یہ حکم مجتہد کا صحیح ہے اور وہ غلط ہے۔ آج کل کس کو یہ لیاقت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو علوم مذکورہ بالا (لغت۔ صرف و نحو۔ معانی۔ بیان۔ تفسیر حدیث۔ فقہ۔ اصول فقہ وغیرہ) میں واقفی ہوگی۔ وہ بتلا دے گا، جن عوام کالانعام کو خبر نہیں وہ اپنے وقت کے موجودہ علماء سے دریافت کر کے عمل کر لیں گے کیونکہ ان کو یہی حکم ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (یعنی خدا فرماتا ہے، اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لیا کرو) پس وہ بیچارے عوام کالانعام جو علم سے بے بہرہ ہیں وہ انہی اپنے زمانہ کے علماء سے پوچھیں گے

نہ مجتہدین متقدمین سے۔ مجتہدین سے پوچھیں تو آخر اُن سے بلاواسطہ کیسے پوچھ سکیں اُن سے پوچھنا بھی یہی ہے کہ موجودہ علماء سے پوچھیں، پھر بعد پوچھنے کے چونکہ مجتہد کا قول بلا اثر بادرن مطابقت حجت نہیں۔ علماء وقت سے اس قول کی مطابقت اور صحت دریافت کریں تو آخر سب کچھ علماء وقت کے بتلانے پر موقوف رہا، اسی لیے فقہا نے لکھا ہے: العامی لامذھب لہ انما مذھبہ مذھب مفتیہ یعنی عوام کا اپنا مستقل کوئی مذہب نہیں بلکہ اُن کا مذہب وہی ہے جو اُن کے فتویٰ دینے والے کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا بلکہ کل اہلِ اسلام کا یہی مذہب ہے کہ سوائے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے منصبِ شریعت کسی کو نہیں۔ صحابی ہو یا مجتہد۔ تابعی ہو یا محدّث سب کے سب اس میں مساوی الاقدام ہیں۔ سہ

بابا کے یہاں سے کون لایا	جس نے پایا یہیں سے پایا
گو غوث و قطب و مقتدا ہے	وہ بھی اسی در کا اک گدا ہے

البتہ علم اور فہم میں ان کے مراتب مختلف ہیں جو باریک مسائل معمولی علم والوں کی سمجھ میں نہ آئیں وہ مجتہد سمجھ سکتے ہیں مگر ایجادِ حکم کا منصب اُن کو نہیں، نیز یہ کہ اُمورِ منصوصہ میں اجتہاد کی ضرورت نہیں بلکہ جائز ہی نہیں جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ میں اوّلاً نظر قرآن و حدیث پر ہو۔ اور اگر قرآن و حدیث سے کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آوے تو مجتہدین کے اقوال پر توجہ کی جائے گی، جس مجتہد کا قول بقاعدۂ شرعیہ و اصولِ حدیث و فقہ مدلّل اور راجح معلوم ہو، اس پر عمل کر لیا جائے اس میں کسی کی خصوصیت یا لزوم نہیں۔ اور یہی مذہب تمام سلف و خلف کا ہے نہ اس

میں کسی امام کی ہتک ہے نعوذ باللہ کوئی سب و شتم ہے کیونکہ اگر کسی مجتہد کا قول چھوڑنے سے اُس کی ہتک لازم آتی ہو تو کوئی فرقہ اس ہتک سے بری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین باقی اماموں کے اقوال کو چھوڑتے ہیں جس سے سب کی ہتک ان کو لازم آئے گی۔ علیٰ ہذا القیاس باقی اماموں کے مقلد بھی اپنے اماموں کے سوا دُوسرے اماموں کی ہتک کے مرتکب ہوں گے، بلکہ اس سے بھی ذرا اُوپر چڑھیے۔ ہم مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے اور قرآن و حدیث بھی اس پر ناطق ہیں کہ مقابلہ آیت یا حدیث نبوی کے انبیاء سابقین کی تعلیم متروک ہے تو کیا اس میں ہم سب کے سب مسلمان انبیاء علیہم السلام کی ہتک اور توہین کرتے ہیں؟ دلم یقل بہ احد الا من سفہ نفسہ پس اسی طرح اس صورت کو سمجھ لینا چاہیے۔

ایک بڑا شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اہلحدیث اگر کسی مجتہد کی تقلید نہیں کرتے تو آخر محدثین کی تو کرتے ہیں پس تقلید سے تو کوئی نہ چھوٹا۔ کسی نے مجتہد کی تقلید کی تو کسی نے محدث کی مگر بغور دیکھا جائے تو ایسے شبہات پیش کرنے والوں کا قصور نہیں۔ قصور صرف یہ ہے کہ اہلحدیث کے مذہب سے ناواقف ہیں جس پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ "تو آشنائے حقیقت نئی خطا ایں جاست" تقلید اور قبولِ روایت میں بڑا فرق ہے، کوئی امام مجتہد یا محدث بلکہ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی روایت سنا دے اور وہ بقاعدہ علم حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا ماننا ضروری ہے۔ روایت کے قبول ہونے کے لیے مجتہد ہونا بھی ضروری نہیں، یہی وجہ ہے کہ راویانِ حدیث میں بہت سے غیر مجتہد ہیں، بلکہ علماء اصولِ حنفیہ

نے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے زیادہ روایت کرنے والے یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس جیسوں کو غیر مجتہد صاف لفظوں میں لکھا ہوا ہے (دیکھو نور الانوار حسامی وغیرہ) حالانکہ ان کی روایت سب کے نزدیک معتبر ہے وہی راوی جس کی حدیث کو بسر و چشم رکھا گیا تھا، اگر کوئی مسئلہ اپنی فہم اور اجتہاد سے بتلاتا ہے تو اس کی سو طرح سے پڑتال ہوتی ہے پہلی تو یہ کہ آیا یہ قائل مجتہد بھی ہے یا نہیں اگر ہے تو اس نے یہ استنباط کس حدیث سے کیا ہے پھر یہ اس کا استنباط کسی نص شریعت کے خلاف یا کسی ایسی جگہ تو نہیں جس میں نص موجود ہو وغیرہ وغیرہ پس تقلید اور قبول روایت دونوں ایک ہی ہیں تو اتنا فرق کیوں ہے ہم لوگ روایت تو ہر محدث اور مجتہد کی قبول کرتے ہیں، مگر درایت یعنی مجتہد اور محدث کے فہم کے پابند نہیں الا انہی شرائط سے جو تمام علماء اصول نے لکھے ہیں اور اس میں ہم ہی منفرد نہیں تمام علمائے سلف ہمارے ساتھ ہیں۔

علاوہ اس کے اگر قبول روایت بھی تقلید ہے تو فیصلہ شد کیونکہ اہلحدیث اور مقلدین کا اس مسئلہ میں اختلاف تھا، کہ آیا ایک ہی امام کی تقلید واجب ہے، یا نہیں۔ مقلدین اس کے وجوب کے قائل ہیں اور اہلحدیث اس سے منکر ہیں لیکن مقلدین نے عملی طور سے ثابت کر دیا کہ وہ بھی تقلید شخصی نہیں کرتے اس لیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کے علاوہ وہ امام بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ شافعی مالک وغیرہم رحمہم اللہ علیہم اجمعین کی روایات بھی تو مانتے اور قبول کرتے ہیں حالانکہ بقول معترضین قبول روایت اور تقلید میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اسی بناء پر وہ اہلحدیث کو ائمہ حدیث کے مقلد سمجھتے ہیں تو پھر تقلید شخصی کہاں رہی بلکہ مقلدین

نے بھی کئی ایک اماموں کی روایت قبول کر کے تقلید شخصی سے علیحدگی کا ثبوت دیا۔ جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم ایسے معرکۃ الآراء پر از غیظ و غضب سب وعدہ و التزام بغیر کسی فریق یا شخص کی دل آزاری کے صاف نکل گئے ہیں تاہم اگر کوئی صاحب محض اظہار مسئلہ سے کبیدہ خاطر ہوئے ہوں تو معاف فرما دیں۔

ع مجھ میں اک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں

قرأتِ فاتحہ خلف الامام

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ امام اور مقتدی دونوں پر قرأتِ فاتحہ فرض ہے۔ کیونکہ آیتِ قرآنی فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ دونوں (امام اور مقتدی) پر قرأت کا حکم لگاتی ہے چنانچہ نور الانوار میں بھی ہے فان الاول (ای آیۃ فاقرؤا (بعمومہ یوجب القرأۃ علی المقتدی) ۱۹۴ مطبوعہ انوار محمدی لکھنؤ یعنی یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے مقتدی پر بھی قرأت فرض بتلاتی ہے۔

ہاں اس پر یہ شبہ باقی ہے کہ اس آیت سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو عام قرأت ہے گو مقتدی بھی سہی، مگر فاتحہ کی تخصیص کا ذکر نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت موصوفہ مفروض کی تعیین میں مجمل ہے جس کا بیان حدیث نے کر کے مطلب کھول دیا ہے۔ چنانچہ بخاری مسلم کی متفقہ روایت میں ارشاد ہے کہ: لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب یعنی جو کوئی سورت فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز صحیح نہ ہوگی بلکہ مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان معنی کی حدیث سن کر لوگوں نے کہا کہ انا نکون وراء الامام یعنی ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا اقرء بھا فی نفسك (تو اس وقت

بھی آہستہ آہستہ بھی اُس کو پڑھ لیا کرو)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ان تمام مضامین میں حکم اور قولِ فیصل ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ:۔

عن عبادۃ ابن الصامت قال کنا خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلوٰۃ الفجر فقرأ فثقلت علیہ القرأۃ فلما فرغ قال لعلکم تقرءون خلف امامکم قلنا نعم یا رسول اللہ قال لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بہا۔ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)	عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک روز صبح کی نماز پڑھ رہے تھے پڑھتے پڑھتے آپ قرأت سے رُک گئے۔ جب فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا کہ تم امام کے پیچھے کچھ پڑھا کرتے ہو، ہم نے عرض کیا ہاں حضرت ایک روایت میں ہے کہ سبح اسم اونچی آواز سے پڑھی تھی (بیہقی) فرمایا سوائے فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز درست نہیں۔

اس حدیث سے نہ صرف اس امر کی تصریح ہوتی ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ کا پڑھنا اُسی طرح فرض ہے جیسا کہ سرّی میں کیونکہ یہ واقعہ ہی صبح کی نماز کا ہے اس مسئلہ میں ہمارے پر بڑا بھاری معارضہ ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث نبوی سے پیش کیا جاتا ہے جس کا بیان معہ مختصر جواب کے یہ ہے:

آیت موصوفہ یہ ہے اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (یعنی خدا فرماتا ہے جب قرآن پڑھا جائے تو تم خاموش رہ کر سُنا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جاوے) چونکہ جہری نماز میں امام بلند پڑھتا ہے تو اس آیت کے

بموجب مقتدی کو خاموش رہنا چاہیے اور حدیث میں ہے کہ من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ یعنی جو شخص امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہو اُس کے امام کی قرأت بس اس کی قرأت ہے پھر مقتدی کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ آیت کے خلاف باوجود قرآن سُنے جانے کے بجائے خاموشی کے پڑھنے سے حکمِ الٰہی کے خلاف کرے۔

یہ ہے معارضہ کی مختصر تقریر جس کا جواب یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس حالت میں قرآن بطور وعظ و نصیحت کے پڑھا جائے، اُس وقت تم دل لگا کر سنو اور خاموش رہو کیونکہ مکہ شریف کے مشرک کہا کرتے تھے لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ یعنی مشرک اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ قرآن نہ سنا کرو بلکہ اس کے پڑھے جانے میں شور و شغب کیا کرو تا کہ تم اس کی آواز پر غالب آجاؤ جس کے جواب میں یہ ارشاد خداوندی پہنچا کہ تم مخنو! جب قرآن سنو تو چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے، ان معنی کا ثبوت خود حنفیہ کرام کی کتابوں سے ملتا ہے، ہدایہ میں صاف لکھا ہے کہ صبح کی نماز ہوتے ہوئے مقتدی صبح کی سنتیں مسجد کے دروازے پر پڑھ لیا کرے، حالانکہ امام کے پڑھنے کی آواز اس کے کانوں میں آتی ہو گی۔ علاوہ ازیں درسگاہوں میں ایک کے پڑھتے ہوئے دُوسرا بھی پڑھتا ہے اور خاموش نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس سے کوئی عالم منع کرتا ہے حالانکہ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ صادق آتا ہے نیز امام کے پڑھتے ہوئے مقتدی مسبوق آکر ملتا ہے تو تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہتا ہے، حالانکہ قرآن کے پڑھے جانے کے وقت بالکل خاموشی چاہیے جو اللہ اکبر کہنے سے کسی قدر فوت

ہوتی۔ پس ان اور ان جیسی کئی ایک مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت موصوفہ کے معنی وہی صحیح ہیں جو ہم نے بتلائے ہیں، یعنی جس وقت قرآن بطور وعظ و نصیحت کے پڑھا جائے تو دل لگا کر سنا کرو اور اس میں تو شک نہیں کہ نماز میں قرآن کا پڑھنا بطور ذکر ہے نہ بطور تذکیر یہی وجہ ہے کہ جماعت میں خواہ تمام مقتدی جاہل ہوں جو قرآن مجید کا ایک حرف نہ سمجھتے ہوں تو بھی اُن کی نماز درست ہے اور کسی کے نزدیک بھی امام کو اپنے خواندہ کا ترجمہ کر کے سمجھانا ضروری نہیں پس مُدعا صاف ہے کہ امام بحالتِ امامت قرآن مجید بطور ذکر پڑھتا ہے۔ ایسے وقت میں مقتدی کو فاتحہ کا پڑھنا کسی طرح منع نہیں، خاص کر سری نمازوں (ظہر، عصر) وغیرہ میں تو کسی طرح ممانعت نہیں۔

رہا حدیث مذکورہ من کان لہ امام الخ کی بابت سو یہ حدیث صحیح نہیں امام بخاری نے جزءالقرأت میں کہا ہے لم یثبت (ثابت نہیں) دوسرے محدثین بھی قریب قریب اسی کے حکم لگا گئے ہیں۔ ہدایہ کی تخریج میں حافظ زیلعی اور حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے بھی اس کی تصحیح نہیں کی اس لیے وہ احادیثِ صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور بر تقدیر ثبوت بھی وجوب فاتحہ کی منافی نہیں کیونکہ اس میں جو قرأت کا لفظ ہے اس سے سوائے فاتحہ کے باقی قرأت قرآن مُراد ہے۔ اس لیے کہ کتبِ اصول میں صاف لکھا ہے کہ عام اور خاص سے مقابلہ کے وقت عام اتنے حصے میں مخصوص ہو جائے گا جتنے حصے کو عام اور خاص دونوں شامل ہیں۔ نور الانوار میں ہے: اذا اوصی بخاتمہ للانسان ثم بالفص منہ للاخر ان الحلقۃ للاول والفص بینھما بخلاف ما اذا اوصی بالفص بکلام موصول فانہ

یکون بیانالان المراد بالخاتم فیما سبق الحلقۃ فقط فتکون الحلقۃ للاوّل والفص للثانی۔ (صفحہ ۹۶ مطبوعہ انوار محمدی)

چونکہ ادلّہ شرعیہ میں تقدّم تاخّر معلوم نہیں ہو سکتا، اس لیے لامحالہ اتصال پر حمل ہوں گی۔ پس نتیجہ یہ کہ من کان لنا امام والی حدیث میں قرأت سے مراد سوائے فاتحہ کے ہے۔ یہ معنی امام بیہقی وغیرہ نے بھی کیے ہیں اور یہی راجح ہیں جمعًا بین الادلۃ اور یہی ہمارا مذہب ہے کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، باقی میں امام کی قرأت کافی ہے اس سے کسی قدر بافادہ تفصیل سے دیکھنا ہو تو تفسیر ثنائی جلد سوم میں حاشیہ نمبر ۴ ملاحظہ ہو۔[1]

رفع الیدین اہلحدیث کا مذہب ہے کہ نماز میں رکوع کرتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے دونوں ہاتھ مثل تکبیر تحریمہ کے کانوں تک اٹھانے مستحب ہیں کیونکہ صحیح بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ:۔

عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا افتتح الصلوٰۃ واذا کبر للرکوع واذا رفع رأسہ من الرکوع رفعھما کذالک۔ (متفق علیہ)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھ اُٹھاتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے تب بھی ہاتھ اُٹھاتے اور جب رکوع سے سر اُٹھاتے تب بھی دونوں ہاتھ اُٹھاتے۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفع یدین کرنے میں کسی فریق کو اختلاف

[1] ثنائی ترجمہ والے قرآن مجید کے آخر میں یہ مقالہ تفصیل مزید کے ساتھ ملحق ہے (راقم عفی عنہ)

نہیں۔ حنفیہ بھی مانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین عند الرکوع کیا۔ مگر منسوخ کہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں زیادہ ثبوت دینے کی اس موقع پر حاجت نہیں، بلکہ فریق ثانی کے ذمہ ہے کہ وہ نسخ کا ثبوت دیں۔ اس لیے بجائے مزید ثبوت دینے کے حنفیہ کرام کے دعویٰ نسخ کی پڑتال مناسب ہے۔

اس دعویٰ پر احناف کی سرِ دفتر دو حدیثیں ہیں اُن میں سے بھی ایک اوّل اور ایک دوم درجہ۔ اوّل سرِ دفتر حدیث روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے جو ترمذی میں موجود ہے جس کے الفاظ معہ ترجمہ یہ ہیں کہ :-

قال عبد اللہ بن مسعود الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اوّل مرّۃ۔ (ترمذی)	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ بتلاؤں، یہ کہہ کر انہوں نے نماز پڑھی تو سوائے اوّل مرتبہ کے رفع یدین نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ رفع یدین منسوخ ہے، جب ہی تو ایسے بڑے جلیل القدر صحابی نے رفع یدین نہ کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی حدیث سے نسخ ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے کہ ممکن ہے ابن مسعودؓ کے نزدیک جیسا کہ ہمارا مذہب ہے رفع یدین ایک مستحب امر ہو، جس کے کرنے پر ثواب ملتا ہے اور نہ کرنے پر نماز کی صحت میں کوئی خلل نہیں آتا۔ علاوہ اس کے کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک امر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایات صحیحہ ثابت ہو وہ صرف کسی صحابی کے نہ کرنے سے منسوخ قرار دیا جائے حالانکہ وہ حدیث بقول عبداللہ بن مبارک جیسے جلیل القدر محدث کے ثابت بھی نہیں اگرچہ بتحقیق امام ترمذی حسن ہے

تو بھی صحیح کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی، خصوصًا جس حال ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے بعد صحابہ کا اس پر عمل عام طور پر ثابت ہے تو دعویٰ نسخ کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے۔

عن ابی حمید الساعدی سمعتہ	ابو حمید ساعدی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
فی عشرۃ من اصحاب النبی	کے بعد دس صحابہ کی مجلس میں دعویٰ کیا۔ کہ
صلی اللہ علیہ وسلم یقول انا	میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تم سے
اعلمکم بصلوٰۃ رسول اللہ صلی	بہتر جانتا ہوں۔ اُن کے کہنے پر اُس نے
اللہ علیہ وسلم الی ان قال ثم	بتلائی تو رکوع کرتے ہوئے اور سر اُٹھاتے
یقول ثم یکبر ویرفع یدیہ حتی	ہوئے دونوں وقت رفع یدین کی اور
یحاذی بھما منکبیہ ثم یرکع الی	اُن دسوں صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم
ثم سلم قالوا صدقت ھکذا کان	اجمعین) نے تصدیق کی کہ بیشک آنحضرت
یصلی۔ رواہ ابو داؤد۔ دارمی۔	صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز پڑھا کرتے
ترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح)	تھے۔

یہ روایت اور دس صحابہ کرام کی تصدیق ملانے سے صاف سمجھ میں آتا ہے
کہ جن روایتوں میں آیا ہے کہ کسی ایک آدھ صحابی نے رفع یدین نہیں کی اُن کو نماز
کے ضروری ضروری ارکان خصوصًا قومہ جلسہ اعتدال وغیرہ (جن میں عمومًا لوگ
سستی کیا کرتے ہیں چنانچہ حدیث مسئی الصلوٰۃ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت
کے زمانہ میں بعض لوگ ارکان صلوٰۃ میں سستی کرتے تھے) کی نسبت حاضرین کو
تنبیہ کرنی مقصود ہوتی تھی، نہ کہ امور مستحبہ کا بیان بھی۔
علاوہ اس کے اگر کسی امر میں جو سرور کائنات علیہ افضل التحیۃ والصلوٰۃ سے

ثابت ہو۔کسی ایک آدھ صحابی کے نہ کرنے سے نسخ ہوسکتا ہے، تو یہی ابن مسعود رضی اللہ عنہ رکوع کے وقت چونکہ تطبیق[1] کرتے تھے، دونوں ہاتھوں کو زانوؤں پر نہ رکھتے تھے چنانچہ صحیح مسلم میں اُن کا یہ مذہب ثابت ہے۔ بلکہ اپنے شاگردوں کو اس فعل کی تاکید مزید کیا کرتے تھے، تو لامحالہ اس وقت جبکہ انہوں نے رفع نہ کی زانوؤں پر بھی تو ہاتھ نہ رکھے ہوں گے، کیونکہ دوسری روایتوں سے اُن کا یہی مذہب ثابت ہوتا ہے تو بس چاہیے کہ رکوع کے وقت زانوؤں پر ہاتھ رکھنے بھی منع ہوں۔ حالانکہ کسی کا مذہب نہیں، اور تو کسی کا کیا ہوتا خود حنفیہ کا بھی نہیں۔ بلکہ اگر اس قسم کی روایات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہوں کہ حضورؐ نے سوائے اوّل دفعہ کے رفع یدین نہیں کی تو بھی نسخ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ سنّت خاص کر مستحب امر کے لیے تو دوام فعل ضروری نہیں۔ دوام تو وجوب و جوب ہے۔ سنّت یا مستحب تو وُہی ہوتا ہے کہ فعل[2] مرۃً و ترک اُخری دیکھی کیا ہو، اور کبھی چھوڑا ہو جس کو اہلِ معقول کی اصطلاح میں مطلقہ عامہ کہنا چاہیے اور یہ تو ظاہر ہے کہ مطلقہ عامہ کی نقیض مطلقہ عامہ نہیں ہوتا۔ فافھم۔

دوسری دلیل نسخ پر جسے آج کل بڑے زور سے بیان کیا جاتا ہے مسلم کی حدیث ہے جس کے الفاظ مع مطلب یہ ہیں کہ :۔

مالی اراکم رافعی ایدیکم	رسولِ پاک نے صحابہ کو نماز میں ہاتھ
کانھا اذناب خیل شمس ۔	اُٹھاتے دیکھا۔ تو فرمایا کیا سبب ہے کہ

---

[1] : تطبیق کے معنی ہیں رکوع کے وقت دونوں ہاتھ دونوں زانوؤں کے اندر دینا۔

[2] : دیکھیے کتب اصول۔

تم اسی طرح ہاتھ اٹھاتے ہو گویا وہ مست گھوڑوں کی دمیں ہیں۔ (مسلم)

کہا جاتا ہے کہ اس حدیث سے رفع یدین کا نسخ ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضورؐ نے نماز کے اندر ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا تو ہر قسم کی رفع یدین جو نماز کے اندر ہوگی منع ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت مجمل ہے مفصل خود اس شبہ کا جواب دیتی ہے۔ چنانچہ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ :-

قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا سلمنا قلنا بایدینا السلام علیکم فنظر الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ما شانکم تشیرون بایدیکم کانھا اذناب خیل شمس اذا سلم احدکم فلیلتفت الی صاحبہ ولا یؤمی بیدہ (مسلم باب الامر بالسکون فی الصلوٰۃ)	میں نے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو ہماری عادت تھی کہ جب ہم اخیر نماز کے سلام پھیرتے تو اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرکے السلام علیکم کہا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے ہمیں دیکھا تو فرمایا تمہیں کیا ہوا کہ ہاتھوں سے ایسے اشارے کرتے ہو گویا وہ مست گھوڑوں کی دمیں ہیں جب کوئی سلام دیا کرے تو اپنے ساتھی کی طرف دیکھا کرے اور اشارہ نہ کیا کرے۔

پس یہ مفصل روایت ہی جواب کافی دے رہی ہے کہ بات کچھ اور ہے حضورؐ نے اس بے محل رفع یدین سے منع فرمایا ہے جو سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے تھے نہ کہ عندالرکوع والی رفع یدین کو۔ علاوہ اس کے نسخ میں تقدم و تاخر کا علم قطعی ہونا چاہیے، جو یہاں پر نہیں، بھلا اگر کوئی یوں کہہ دے کہ یہ روایت رالشیر بلکہ اس کو

رفع یدین عندالرکوع سے تعلق ہو) خود ابن عمر کی روایت مذکورہ سے منسوخ ہے۔ کیونکہ ابن عمر اور دیگر صحابہ کرام رفع یدین پر بعد انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عمل کرتے رہے تو اس کا جواب شاید قائلین نسخ پر سہم سے زیادہ مشکل ہو اخیر میں اپنے بھائیوں کو فخر المتاخرین حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس اللہ سرہٗ کا اس مسئلہ میں فیصلہ سنا کر بحث ختم کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے صاف فرمایا ہے والذی یرفع احب الی ممن لا یرفع فان احادیث الرفع اکثر واثبت (حجۃ اللہ البالغۃ۔ اذکار وھیات) یعنی جو لوگ رفع یدین رکوع کے وقت جاتے ہوئے اور سر اٹھاتے ہوئے کرتے ہیں وہ نہ کرنے والوں سے مجھے زیادہ پیارے ہیں کیونکہ رفع یدین کرنے کی حدیثیں تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ثبوت میں بھی پختہ۔ مزید بحث رفع یدین کی دیکھنی ہو تو رسالہ تنویر العینین[1] مصنفہ مولانا شاہ اسماعیل شہید قدس سرہٗ ملاحظہ ہو۔

آمین بالجہر

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ جب امام اونچی قرأت پڑھے تو بعد ولا الضالین، کے مقتدی بلند آواز سے آمین کہیں کیونکہ:۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ علیہ وسلم اذا تلا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ قال آمین، حتی یسمع	ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھتے تو آمین، کہتے۔

[1] : یہ رسالہ عربی میں ہے جس کو مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے ادارہ اشاعۃ السنۃ نے شائع کردیا ہے۔ (ناشر)

من يليه من الصف الاول۔ (رواه ابوداؤد وابن ماجه) وقال حتى يسمعها اهل الصف الاول فيرتج بها المسجد (المنتقى)

ایسی کہ پہلی صف والے سُن لیتے پھر سب لوگ بیک آواز آمین کہتے تو تمام مسجد آواز سے گونج جاتی۔

اس مسئلہ نے اپنی قوت ثبوت کی وجہ سے بعض محققین علماء حنفیہ کو بھی اپنا قائل بنالیا۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی شرح وقایہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔

قد ثبت الجهر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم باسانيد متعددة يقوى بعضها بعضا فى سنن ابن ماجة والنسائى وابى داؤد وجامع الترمذى وصحيح ابن حبان وكتاب الام للشافعى وغيرها وعن جمع من اصحابه برواية ابن حبان فى كتاب الثقات وغيره ولهذا اشار بعض اصحابنا كابن الهمام فى فتح القدير وتلميذه ابن امير الحاج فى حلية المحلى شرح منية المصلى الى قوته رواية۔ (حاشيه شرح وقايه)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد سندوں کے ساتھ آمین بالجہر کہنا ثابت ہے وہ ایسی سندیں ہیں کہ ایک دوسری کی تقویت کرتی ہیں۔ ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، صحیح ابن حبان، امام شافعی کی کتاب الام وغیرہ میں موجود ہیں۔ آنحضرتؐ کے صحابہؓ سے بھی ابن حبان کی روایت سے ثابت ہے۔ اسی واسطے ہمارے بعض علماء مثل ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور اُن کے شاگرد ابن امیر الحاج نے حلیۃ المحلی شرح منیۃ المصلی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آمین بالجہر کا ثبوت باعتبار روایات کے قوی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ہمارے مذہب کے خلاف یا یُوں کہیے کہ اپنے مذہب کے ثبوت کے لیے دو دلیلیں لکھی ہیں۔ ایک تو ابن مسعود رضی عنہ کا قول ہے کہ "چار چیزیں امام آہستہ کہے اُن میں سے ایک آمین بھی ہے" ادبع یخفیھن الامام وذکر من جملتھا التعوذ والتسمیۃ وآمین (ھدایۃ)

اس کا جواب بھی وہی ہے جو رفع یدین کے مسئلہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ کوئی فعل جو سرور کائنات علیہ افضل الصّلوٰۃ والسّلام سے ثابت ہو کسی صحابی کے عدمِ فعل سے ردّ یا منسوخ نہیں ہوسکتا۔ جبکہ آمین بالجہر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے تو پھر کسی طرح کسی صحابی کے نہ کرنے یا منع کرنے سے منع نہیں ہوسکتی البتہ صحابی کو معذور سمجھنے کے لیے کوئی تاویل کرنی پڑے گی۔ سو جو تاویل باقی مسائل میں حنفیہ کرام کریں گے وُہی ہم اس مسئلہ میں کریں گے کہ اس صحابی سے یہ فعلِ نبوی مخفی رہا۔ ہاں اگر کسی کو یہ تاویل پسند نہ ہو تو وُہ انہی حضرت ابن مسعودؓ کی رکوع کے وقت تطبیق کرنے وغیرہ مسائلِ خلافیہ مختلفہ عبادات و فرائض کی کوئی معقول توجیہہ بتا دیں تو ہم بھی اُسی پر دستخط کر دیں گے۔

دوسری دلیل صاحبِ ہدایہ نے یہ دی ہے کہ:

ولانہ دعاء فیکون مبناہ علی الاخفاء (ھدایۃ) — آمین دُعا ہے۔ پس یہ مخفی ہونی چاہیے۔

اس دلیل میں آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے:۔

ادعوا ربکم تضرعًا وخفیۃ (القرآن) — اپنے پروردگار کو عاجزی سے اور خفیہ پکارو۔

لیکن بڑے ادب سے عرض ہے کہ آمین اصل دُعا نہیں بلکہ استجابتِ دُعا

ہے بو اگر ہے تو گویا دُعا ہے یعنی جو دُعا امام نے کی ہے اس کی قبولیت کی درخواست ہے پس اصل دُعا جو امام کر رہا ہے یعنی سورۂ فاتحہ پڑھ رہا ہے آگے تو آہستہ پڑھنے کا حکم نہیں دیتے اور جو اسی دُعا کی استجابت کی درخواست کرے اس استجابت کو اس آیت سے منع کریں لعمری ان ھٰذا الا عجب العجاب پس جب امام اُونچی آواز سے دعا کرے گا مقتدی بھی استجابت بلند آواز سے کرے گا، اور جس وقت آہستہ دُعا کرے گا مقتدی بھی آہستہ استجابت کرے گا۔ سارا مدار امام پر ہے پہلے امام کو روکنا چاہیے فافہم

آخیر میں ہم محققین حنفیہ کا فیصلہ متعلق مسئلہ ہذا نقل کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ شیخ ابن الھمام شارح ہدایہ فتح القدیر میں مسئلہ ہذا (آمین بالجہر) میں بالکل اہلحدیث کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

لوکان الی فی ھٰذا شیئ لوفقت بان روایۃ الخفض یراد بہا عدم القرع العنیف وروایۃ الجہر بمعنی قولہا فی زیر الصوت وذیلہ یدل علی ھٰذا ما فی ابن ماجۃ کان رسول اللہ علیہ الصلٰوۃ والسلام اذا تلی غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین قال آمین حتی یسمع من الصف الاول فیرتج بہا المسجد ــــــ الخ	اگر مجھے اس امر میں اختیار ہو (یعنی میری رائے کوئی شے ہو) تو میں اس میں موافقت کردوں کہ جو روایت آہستہ والی ہے اس سے تو مراد ہے کہ بہت زور سے نہ چلّانے بلکہ اور جہر کی آواز سے مراد گونجتی ہوئی آواز ہے میری اس توجیہ پر ابن ماجہ کی روایت دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضآلین پڑھتے تھے تو آمین کہتے (یہی) کہ پہلی صف والے سن لیتے

تھے پھر دیرے لوگوں کی آواز ملنے سے) مسجد گونج جاتی تھی۔

نورالقدیر۔ جلد اوّل ص۱۱۷ (نولکشوری)

اظہارِ تشکّر:۔ اہلحدیث کو فخر ہے کہ اُن کے مسائل قرآن و حدیث سے ثابت ہو کر ائمۂ سلف کے معمول بہ ہونے کے علاوہ صوفیائے کرام میں سے مولانا مخدوم جہانی محبوبِ سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرّہٗ العزیز بھی اُن کی تائید میں ہیں۔ چنانچہ اُن کی کتاب غنیۃ الطالبین کے دیکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ حضرت ممدوح نے آمین اور رفع یدین کو کس وضاحت سے لکھا ہے زہے قسمت ؎

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست   کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

پس صوفیائے کرام کی خدمت میں عموماً اور خاندان قادریہ کی جناب میں خصوصاً بڑے ادب سے عرض ہے کہ وہ ان دونوں سنتوں کے رواج دینے میں دل و جان سے سعی کریں اور اگر خود نہ کریں تو اُن کے رواج دینے والے فرقہ اہلحدیث سے دلی محبت اور اخلاص رکھیں کیونکہ ؎

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
ایں سگے در کوئے لیلیٰ گاہے گاہے رفتہ بود

سینہ پر ہاتھ باندھنے

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے چاہئیں کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ:۔

عن وائل ابن حجر قال صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوضع یدہ الیمنی علی یدہ الیسریٰ علی صدرہ (ابن خزیمہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے وقت سینہ پر ہاتھ باندھتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تو یہ مسئلہ قرآن شریف ہی سے بتلایا ہے، چنانچہ :-

عن ابن عباس قال فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ قال وضع الیمین علی الشمال فی الصلوٰۃ عند النحر	آپ آیت وانحر کے معنی کرتے ہیں کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر سینہ پر رکھو (تفسیر معالم التنزیل)

اور جو حدیث حضرت علی والی، صاحب ہدایہ نے ناف سے نیچے باندھنے کی نقل کی وہ صحیح نہیں (دیکھو تخریجات ہدایہ) امام نووی نے شرح مسلم میں اس حدیث کی بابت لکھا ہے کہ تمام حفاظِ حدیث اس کے ضعف پر متفق ہیں۔

وجوب جمعہ اور ظہر احتیاطی

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ جمعہ علی الاطلاق واجب ہے حنفیہ اور دیگر علماء کے نزدیک بھی وجوب جمعہ مسلّم ہے مگر وہ چند شروط ایسی لگاتے ہیں جو اہلحدیث کے نزدیک ثابت نہیں اس لیے مناسب ہے کہ ثبوت فرضیت سے درگذر کر اُن ہی شرائط پر بحث کی جائے، حنفیہ کرام کا مذہب ہے کہ جمعہ کے واسطے شہر اور قاضی کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے :-

لا یصح الجمعۃ الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر ولا تجوز فی القری لقولہ علیہ السلام لا جمعۃ ولا تشریق ولا فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع والمصر الجامع کل	جمعہ صرف شہر یا اس کے مضافات (عیدگاہ وغیرہ) میں ہوگا۔ کیونکہ حضرت علیہ السلام نے فرمایا ہے نمازِ جمعہ

موضع لہا امیر و قاضی ینفذ الاحکام ویقیم الحدود (ھدایہ باب الجمعۃ)

اور نماز عید فطر اور نماز عید اضحی سوائے شہر کے نہیں چاہیے۔

یہ روایت نقل کرنے کے بعد صاحب ہدایہ شہر کی تعریف بتلاتے ہیں کہ جہاں حاکم ہو اور جو احکام اور حدود قائم کرے۔

پس یہی ایک حدیث ہے جس سے اس امر کا ثبوت دیا جاتا ہے کہ جمعہ کے لیے شہر اور قاضی وغیرہ کا ہونا ضروری ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مرفوع صحیح نہیں۔ امام نووی نے کہا ہے "متفق علےٰ ضعفہ" یعنی (سب محدث اس کے ضعف پر متفق ہیں) بیہقی نے کہا ہے کہ اس مضمون کی کوئی حدیث صحیح نہیں آئی۔ تخریجات ہدایہ زیلعی اور عسقلانی میں اس کو ضعیف بتلایا ہے۔ ہاں حضرت علی کا قول ہے۔ سو بموجب اصول حدیث و فقہ مسائل اجتہادیہ میں صحابی کا قول حجت نہیں ہوتا۔ خاص کر ایسے مسائل میں جہاں اور صحابہ اس کے خلاف پر بھی ہوں بیہقی نے لیث بن سعد سے روایت کی ہے کہ مصر اور اس کے مضافات والے جو دریا کے کنارے کنارے رہتے تھے حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے حکم سے جہاں ہوتے جمعہ پڑھ لیتے۔ عبدالرزاق نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان لوگوں کو اپنے پانی کے جوہڑوں پر جمعہ پڑھتے دیکھتے تو منع نہ کرتے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بحرین والوں کو حکم بھیجا تھا کہ تم جہاں ہو جمعہ پڑھ لیا کرو۔ علماء اصول فقہ حنفیہ نے صاف لکھا ہے کہ جس مسئلہ میں صحابہ کے اقوال باہمی مختلف ہوں ان میں ہم کو اختیار ہے کہ کسی صحابی کی پیروی کر لیں (دیکھو نور الانوار بحث

تقلید الصحابی) جب تک کوئی مرفوع حدیث نہ ہو وجوب نہیں ہوتا۔
پس جب کسی حدیث صحیح یا آیت قرآنی سے شرطیت ثابت نہیں ہوتی تو بحکم حضور علیہ السلام ذرونی ما ترکتکم[۱] جمعہ بلا شرط فرض رہے گا۔ اِلّا وہی شرائط جن کا ثبوت شرع میں ہو، اسی لیے اہلحدیث کا مذہب ہے کہ ہر ایک جگہ جمعہ واجب ہے۔ کہیں ہوں، شہر ہو یا گاؤں جہاں پر دو یا زیادہ آدمی ہوں گے بحکم الاثنان فما فوقہا جماعۃ جمعہ پڑھیں گے فمن ادعی غیر ذٰلک فعلیہ البیان والبرہان۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد طویل الذیل بحث ظہر احتیاطی کی ہے جس پر آج کل بہت سی رائے زنیاں ہو رہی ہیں مگر ہمارے نزدیک بلکہ ہر ایک محقق کے نزدیک یہ رائے زنیاں محض بے بنیاد ہیں اس لیے کہ یہ مسئلہ بھی فقہائے حنفیہ شکر اللہ سعیہم نے خود ہی فیصل کر دیا ہوا ہے دراصل وجہ اور بنار ظہر احتیاطی کی (جیسا کہ طحطاوی کی آئندہ عبارت سے معلوم ہو گی) یہ ہے کہ بعض علمار کے نزدیک ایک بستی میں متعدد جگہ جمعہ جائز نہیں، اس لیے جس جگہ متعدد مقامات پر جمعہ پڑھنے والوں کو ایسے علمائے نے ظہر احتیاطی کا حکم دیا ہے، گو اہلحدیث کے نزدیک تو کوئی مسئلہ بھی جو قرآن وحدیث سے مدلل نہ ہو قابلِ پذیرائی نہیں۔ اس لیے اُن کو تو ایسے اقوال کیا ہی اثر کر سکتے تھے، مگر شکر ہے کہ محققین علمار حنفیہ نے ایسی ایسی روایات سے صریح انکار کیا۔ درِ مختار میں صاف ہے کہ:۔

وتودی فی مصر واحد بمواضع — ایک ہی شہر میں کئی جگہ متعدد ادا ہو سکتا

---

[۱] جب تک میں تم کو حکم نہ دوں تم بھی کرید نہ کیا کرو (منہ)

کثیرة مطلقا علی المذهب و علیه الفتوی (درمختار)

ہے اور یہی مذہب صحیح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

قوله مطلقا سواء کان هنالك ضرورة اولا فصل بین جانبی البلد نهر ام لا قوله علی المذهب لاطلاق الخبر وهو لا جمعة الا فی مصر فشرط المصر۔ فقط (طحطاوی)

اس پر علامہ طحطاوی حاشیہ لکھتے ہیں کہ بیشک ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ ہو سکتا ہے ضرورت ہو یا نہ ہو، شہر کے درمیان کسی نہر وغیرہ کا فاصلہ ہو یا نہ ہو ہر صورت میں جائز ہے کیونکہ حدیث میں صرف شہر کی شرط ہے اور بس۔

ہمارے نزدیک تو شہر بھی نہیں چنانچہ اس کی بحث پہلے آ چکی ہے (مصنف)

اس فیصلہ کے بعد کہ ایک ہی بستی میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے، صاحب درمختار اور طحطاوی کا فیصلہ خاص دربارہ ظہر احتیاطی بتلاتے ہیں۔ مصنف درمختار صاحب بحر سے نقل کرتے ہیں کہ:-

قد افتیت مرارا بعدم صلوٰة الاربع بعدها بنیة آخر الظهر خوف عدم فرضیتها وهو الاحتیاط فی زماننا۔ (ردّ مختار)

میں نے کئی دفعہ ظہر احتیاطی نہ پڑھنے کا فتویٰ دیا ہے کیونکہ خوف تھا کہ لوگ جمعہ کی فرضیت ہی نہ بھول جائیں اور ہمارے زمانہ میں مناسب اور احتیاط یہی ہے کہ ظہر احتیاطی نہ پڑھی جائے۔

قوله قد افتیت الخ هذا کلام مرتبط بکلام قبله للکمال

(اس پر طحطاوی نے بڑی لمبی چوڑی تقریر کی ہے کہتے ہیں کہ ہم نے اس لیے ظہر

فانّما قال وانما اکثرنا فیه ای
فرض الجمعة نوعا من الاکثار
لما نسمع من بعض الجهلة
انهم ینسبون الی مذهب
الامام عدم افتراضها قال
صاحب البحر وقد کثر ذلك من
جهلة زماننا ایضا ومنشا جهلهم
صلوٰة الاربع بعد الجمعة بنیّة
الظهر وانّما وضعها بعض المتاخرین
عند الشك فی صحة الجمعة بسبب
روایت عدم تعددها فی مصر
واحد ولیست هذه الروایة
بالمختار ولیس هذا القول اعنی
اختیار الاربع بعدها مرویا
عن الامام وصاحبیه حتی وقع
لی انی افتیت مرارا بعدم
صلوتها خوفا علی اعتقاد
الجهلة انّها الفرض وان
الجمعة لیست بفرض ۔

احتیاطی نہ پڑھنے کے متعلق طول کلامی سے
کام لیا ہے کہ بعض جاہلوں سے ہم نے
سُنا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ جمعہ فرض
نہیں۔ صاحب البحر نے کہا ہے کہ ہمارے
زمانہ کے جاہلوں میں بھی عام طور پر یہ
خیال شائع ہوا ہے کہ جمعہ فرض نہیں
اور اُن کے اس خیال کی وجہ سے صرف
ظہر احتیاطی ہے۔ اور بعض متاخرین علماء
نے ظہر احتیاطی کو صرف اس لیے تجویز
کیا تھا۔ کہ ایک روایت کے مطابق
ایک ہی شہر میں چند جگہ جمعہ جائز نہ تھا۔
حالانکہ یہ روایت ہی ٹھیک نہیں اور
نہ ہی یہ قول کہ ظہر احتیاطی کی چار رکعتیں
پڑھنی چاہئیں۔ امام صاحب اور دونوں صاحبین
سے منقول ہے حتّٰی کہ مجھے بھی کئی دفعہ
اتفاق ہوا ہے کہ میں نے خود ظہر احتیاطی
نہ پڑھنے کا فتوٰی دیا ہے۔ کیونکہ جاہل
اس کو فرض جان بیٹھے ہیں اور جمعہ کو

فرض نہیں جانتے (دیکھو طحطاوی)   (طحطاوی)

اِن روایاتِ فقہیہ معتبرہ نے ظہرِ احتیاطی کے مسئلہ کا جہاں فیصلہ کیا ہے اُس کی بنا اور وجہ تجویز بھی بتلادی کہ اصل وجہ ظہرِ احتیاطی کی یہ ہوئی ہے کہ بعض متأخرین نے (جن کے نام بھی شاید معلوم نہیں) ایک بستی میں متعدد جگہ جمعہ کا پڑھنا بعض روایاتِ فقہیہ سے ناجائز سمجھا جس پر ظہرِ احتیاطی کا حکم لگایا۔ پھر اس بنیاد کا ابطال بھی صاف لفظوں میں کر دیا کہ یہ روایت کہ ایک ہی جگہ متعدد جگہ جمعہ ناجائز ہے پسندیدہ اور مختار نہیں بلکہ پسندیدہ اور قابلِ فتویٰ یہی بات ہے کہ ایک بستی میں متعدد جگہ بلا شبہ جمعہ جائز ہے پس اب ظہرِ احتیاطی کا قائل ہونا صریح بناءِ فاسد علی الفاسد نہیں تو کیا ہے افسوس کہ اہلحدیث پر خوب یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کتب فقہ کو نہیں مانتے حالانکہ وہ جس طریق سے مانتے ہیں، سب سلف صالحین اُسی طرح مانتے تھے، مگر جب اپنے خلاف کوئی روایت ہو تو باوجود تسلیم صحت اس کتاب کے ہمارے بھائی کانوں پر ہاتھ رکھ کر صاف نکل جاتے ہیں۔ ہمارے پاس موجودہ محققین علماء حنفیہ شکر اللہ سعیہم کے انکاری فتوے بھی اس امر میں موجود ہیں، مگر ہم اُن کو پیش کرنا نہیں چاہتے تاکہ کسی صاحب کو انکار کی گنجائش نہ ہو۔ علاوہ اس کے موجودہ علماء محققین کی تحقیق کی بنا بھی انہی متقدمین فقہا کے اقوال پر ہے اس لیے بحکم الفضل للمتقدم انہی متقدمین کے اقوال کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

ع   درخانہ اگر کس است یک حرف بس ست

خطبہ میں وعظ

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ خطبہ میں خطیب قرآن شریف پڑھ کر اُس کا مطلب دیسی زبان میں بتلاتا جائے اور مناسب مناسب موقع پر تفسیر یا تشریح آیات اور تذکیر حاضرین بھی کرے۔ اتنے مطلب کے لیے کسی آیت یا حدیث کے ثبوت دینے کی حاجت نہیں خطیب کی ہیئت کذائی اور شکل ظاہری حاضرین کی طرف مُنہ کر کے بلند مکان پر کھڑا ہونا اور بصیغہائے خطاب ان کو مخاطب کرنا اور ایھا الناس ایھا الناس کہہ کہہ کر پکارنا ہی کافی دلیل ہے کہ ایسی صورت میں اُس کے کھڑا کرنے سے شریعت کو یہی مقصود ہے کہ لوگ اُس کے کلام کو بغور سُنیں اور مستفید ہوں۔ میری یہ رائے وجدانی رائے ہے کہ خطیب کی شکل اور ہیئت کذائی ہی دیکھنے سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے مقصود شریعت کا یہی ہے کہ لوگوں کو پند و نصائح سنا دیے اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔ اس صُوری دلیل کے علاوہ قرآن و حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، اور اقوال علماء و فقہا بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ خطبہ خطاب سے ماخوذ ہے اور خطاب میں جب تک ہم زبانی نہ ہو، خطاب حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ خدا فرماتا ہے: مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ یعنی جو رسول خدا کی طرف سے آتا رہا وہ اپنی قوم کے محاورہ ہی پر آتا رہا۔ تاکہ اُن کو بیان کر کے مطالب سمجھا دے۔ احادیث اس بارے میں کثرت سے آتی ہیں جن سے یہ مطلب بداہی اور روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ کی وضع شریعت میں اسی غرض کے لیے ہے کہ خطیب حاضرین کو اپنے مافی الضمیر سے اطلاع دے اور وہ بگوشِ دل اس کی باتوں کو سُنیں

چنانچہ ہر ایک حدیث کی کتاب میں یہ مضمون مل سکتا ہے۔ اصحابِ کرام کہتے ہیں فلاں کام پیش آیا تو خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت نے ہم کو خطبہ سنایا اور مطلب سمجھایا۔ ان بیرونی شہادتوں کے علاوہ خاص جمعہ میں خطبہ نبویہ کی کیفیت حدیثوں میں یوں آتی ہے کہ :۔

کانت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت ؐ کے خطبے کے دو حصے ہوتے تھے
خطبتان یجلس بینھما یقرء	(جیسا کہ آج کل بھی دستور ہے) درمیان اُن دونو
القرآن ویذکر الناس۔	کے بیٹھتے تھے، قرآن اُن میں پڑھتے تھے
(مسلم)	اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے۔

یہ حدیث اپنے مضمون بتلانے میں بالکل صاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ میں وعظ فرمایا کرتے تھے نہ صرف قرآن ہی پڑھتے تھے بلکہ یقرء القرآن کے ساتھ یذکر الناس بھی موجود ہے جس کو راوی نے اسی لیے ساتھ ملایا ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کر لے کہ صرف قرآن کا پڑھنا ہی آپ کا وعظ تھا جیسا کہ آج کل کے مانعینِ وعظ کہتے ہیں :۔

ایک حدیث کے الفاظ اور ترجمہ یہ ہے کہ :۔

فاطیلوا الصلوٰۃ واقصروا الخطبۃ	نماز کو لمبا اور خطبہ کو چھوٹا کیا کرو کیونکہ بعض
فان من البیان سحرا (مسلم)	بیان تاثیر میں جادو کی طرح ہیں۔

اس حدیث میں حضور صلعم نے خطبہ کو بیان فرمایا ہے جس میں اتحاد لسان یعنی خطیب اور سامعین کا ہم زبان اور ہم محاورہ ہونا بحکم عرب اور بفحوائے آیت مرقوم اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ الآیۃ ضروری ہے۔

ایک حدیث میں راوی آپ کے خطبہ کی کیفیت یوں بتلاتا ہے کہ :-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب احمرت عیناہ و علا صوتہ واشتد غضبہ حتی کانہ منذر جیش و یقول صبحکم و مساکم (مسلم)	آنحضرت جب خطبہ پڑھتے تو آپ کی آنکھیں سُرخ ہو جاتیں اور آواز بلند ہوتی اور غصہ سخت ہوتا گویا کہ آپ کسی دشمن کی فوج سے ڈراتے تھے اور کہتے تھے کہ ابھی صبح کو یا شام کو دشمن تم پر آنے والا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ :-

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یخطب اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیھما (مسلم)	آنحضرت نے خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ جو کوئی امام کے خطبہ پڑھتے ہوئے آوے وہ خفیف سی دو رکعتیں پڑھ لیا کرے۔

ایک حدیث میں ہے :-

بینما عمر بن الخطاب یخطب یوم الجمعۃ اذ دخل رجل من اصحٰب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ایۃ ساعۃ ھذا فقال ما ھو الا ان سمعت النداء وما زدت علی ان توضات قال والوضوء ایضا وقد علمت ان رسول اللہ صلی اللہ	حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ اسی وقت ایک صحابی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت عمرؓ نے خطبہ ہی میں کہا کہ یہ کون سا وقت آنے کا ہے اس نے کہا : میں تو اذان سنتے ہی وضو کر کے آگیا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کیا صرف وضو ہی پر تو نے قناعت کی ہے حالانکہ تو جانتا ہے

علیہ وسلم امر بالغسل (ترمذی) آنحضرتؐ نے نہانے کا حکم فرمایا ہوا ہے۔

عید کے خطبہ کی کیفیت یوں آتی ہے کہ:۔

فیقوم مقابل النّاس والنّاس جلوس علیٰ صفوفھم فیعظھم ویوصیھم ویامرھم وان کان یرید ان یقطع بعثا قطعہ او یامر بشئی امر بہ ثم ینصرف (متفق علیہ) ۔

بعد نماز آنحضرتؐ لوگوں کے سامنے ہو جاتے اور لوگ اپنی جگہ پہ بیٹھے رہتے، پس اُن کو وعظ کرتے اور وصیت فرماتے اور حکم کرتے اور کسی فوج کو تیار کرنا ہوتا تو اسی خطبہ ہی میں تیار کرتے یا کسی بات کا حکم کرنا ہوتا تو کر دیتے پھر چلے جاتے۔

اِن روایات سے اُس شبہ کا جواب بھی آجاتا ہے جو عموماً اس مسئلہ کے خلاف پر کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے غیر ملکوں میں جا کر عجمی زبانوں میں خُطبہ کا ترجمہ نہیں سُنایا تو معلوم ہُوا کہ سوائے عربی کے اور زبانوں میں ترجمہ نہ چاہیے۔ اس کا جواب اِن روایات سے یوں پایا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے عین خطبہ پڑھتے ہوئے جو یہ فرمایا اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ یا حضرت عمرؓ نے اس صحابی کو دیر کرنے پر ٹوکا، تو کیا اب بھی خطیب کو اگر ایسی حاجت پیش آئے۔ تو عربی ہی میں کہے اور پس کرے یا ان الفاظ کا مطلب سامعین کو سمجھا بھی دے۔ کچھ شک نہیں کہ عربی ہی میں کہنے کو کافی کہنے والا دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک شخص پنجابی جو عربی زبان سے بالکل ناآشنا ہے مسجد میں آئے تو امام اس کی تنبیہ کرنے کو یوں کہے کہ الیتۃ ساعۃ ھٰذہ الوضوء ایضا۔ وقد علمت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر

بالفعل یا اگر امیر نے فوج تیار کی ہو تو پنجابی یا ہندی حاضرین کو عربی زبان میں فرمان دے کر بغیر مطلب سمجھائے چل دے۔ میرے خیال میں دُنیا بھر میں یہ بات کوئی نہ کہے گا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے یہ سب امُور خطبات میں ثابت ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ صحابہ نے اس اصولِ تفہیم کو غیر ملکوں میں ملحوظ نہ رکھا ہو، ہاں یہ ممکن ہے کہ بوجہ اس کے کہ فتح کرتے ہی حاضرین صرف اپنی فوج ہوتی تھی یا جو نومسلم ہوتے وُہ بہت ہی قلیل ہوتے۔ اس لیے بحکم کثرت عربی ہی میں خطبہ سُناتے ہوں گے اور خطیب کا عجمی زبان سے ناواقف ہونا بھی ایک سبب ہو تو اغلب ہے (علاوہ اس کے اس بات کی نسبت کیونکر یقین ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام نے عجمی زبانوں میں خطبہ کا ترجمہ یا مطلب نہیں سُنایا غایت مافی الباب اس کا عدم علم ہے اور عدم علم مقتضی عدم شئے کو نہیں ہوتا، خاص کر اس صورت میں کہ سرورِ کائنات سے ایک فعل ثابت ہو پھر اس کے معمول بہ ہونے کے لیے کسی صحابی یا امام کی تائید کی کیا ضرورت ہے بلکہ اُس فعلِ نبوی کے چھوڑنے پر اُن کے حق میں عذر تلاش ہوتا ہے نہ کہ فعلِ نبوی میں کسی طرح کا ضعف۔

کتبِ فقہ میں بھی یہ مسئلہ (خطبہ میں وعظ کرنا) مصرح ملتا ہے درمختار میں ہے:

(ویبدأ) قبل الخطبة الاولیٰ بالتعوذ سرا ثم بحمد اللہ تعالیٰ والثناء علیه والشهادتین والصلوٰة علی النبی صلی اللہ علیه وسلم والعظة والتذکیر والقرائة (درمختار۔ ذکر جمعۃ)	خطبہ سے پہلے پوشیدہ اعوذ پڑھے پھر حمد اور ثنا کرے اور کلمہ شہادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور وعظ ونصیحت کرے۔ اور قرآن پڑھے۔

درمختار میں ہے کہ:-

ویکرہ تکلمہ فیہا الا لامر بمعروف لانہ منہا۔ (الدر المختار)

امام کو سوائے امر معروف کرنے کے اور بات کرنی منع ہے امر بالمعروف اس لیے مکروہ نہیں کہ وہ تو خطبہ میں ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ:-

ولو خطب قاعدا او علی غیر طہارۃ جاز لحصول المقصود (الہدایۃ) وہو الوعظ و التذکیر (کفایۃ)

ہدایہ میں ہے کہ اگر خطیب بیٹھ کر یا بے وضو پڑھے تو جائز ہے کیونکہ مقصود بے وضو بھی حاصل ہو سکتا ہے "مقصود" کی تشریح کفایہ حاشیہ ہدایہ میں ملتی ہے کہ مقصود خطبہ سے وعظ و نصیحت ہے۔

لکن لا یخلو الاقتصار علی ہذا من الکراہۃ کما فی الدر المختار و جامع الرموز لکونہ خلاف السنۃ فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یخطب خطبتین و یجلس بینہما جلسۃ خفیفۃ و کان یثنی علی اللہ فیہا و یعظ و یذکر و یبین الاحکام المناسبۃ و یقرء ایات من القران۔ (عمدۃ الرعایۃ حاشیۃ شرح وقایۃ)

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی مرحوم نے کہا ہے کہ ایک دو تسبیح پر خطبہ میں کفایت کرنا مکروہ ہے جیسا کہ درمختار اور جامع الرموز میں لکھا ہے کیونکہ یہ خلاف سنت ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دو خطبے پڑھتے تھے جن میں وعظ و نصیحت کرتے اور احکام مناسب بیان فرماتے اور قرآن پڑھتے۔

عالمگیریہ میں ہے کہ:-

"نزد صاحبین فرض آنست کہ ذکر طویل باشد و دو خطبہ خواندن مشتمل بر حمد و صلوٰۃ و تلاوتِ قرآن و وصیت مر مسلمانان را و استغفار برائے نفس خود و برائے مسلمانان نزدِ اکثر ائمہ فرض ست و نزد امام اعظم سنت ست ترکِ آن مکروہ"

بغرضِ اختصار انہی حوالجات پر قناعت کی جاتی ہے ورنہ فقہ کی ہر ایک کتاب میں یہ مسئلہ مصرح مل سکتا ہے، ان تمام حوالجات میں تصریح مذکور ہے کہ خطیب، وعظ و تذکیر خطبہ میں کرے اور دلیل ان سب کی وہی احادیث ہیں جو ہم نے نقل ہیں اور مولانا عبدالحی صاحب مرحوم نے حاشیہ شرح وقایہ کی منقولہ عبارت میں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

افسوس کہ اسلام کا ایک ایسا مسئلہ جو تمام کتب احادیث اور فقہ میں بتصریح تام ملتا ہے اس زمانہ میں ایسا متروک ہے کہ بعض لوگ خطیب کو وعظ کہتے ہوئے سُننے ہیں تو منتظر رہتے ہیں کہ اس وعظ کے بعد خطبہ ہوگا کیونکہ اُن کے نزدیک خطبہ اسی کا نام ہے جس میں وعظ وغیرہ کا نام نہ ہو، صرف عربی زبان میں چند کلمات پڑھ دیے جائیں۔ انا للہ۔

اس سے بڑھ کر افسوس اس طریق پر ہے جو بعض مانعین علماء کا ایجاد ہے کہ خطبہ سے پہلے منبر پر بیٹھ کر دیسی زبان میں وعظ کہتے رہتے ہیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے ہیں تو کھڑے ہو کر عربی زبان میں خطبہ سنا دیتے ہیں جس میں کوئی کلمہ دیسی زبان کا نہیں بولتے۔ نہیں معلوم وہ کس مطلب کے لیے ہوتا ہے یا للعجب۔

مسئلہ تراویح | اہلحدیث کا مذہب ہے کہ رمضان کے مہینے میں آٹھ رکعت اور مع وتر گیارہ رکعت تراویح باجماعت اول شب پڑھنی

سنت ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی روز پڑھی ہیں، چنانچہ حدیث مندرجہ ذیل اس امر پر صریح دلیل ہے :-

عن ابي ذر قال صمنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يقم بنا شيئا من الشهر حتى بقي سبع فقام بنا حتى ذهب ثلث الليل فلما كانت السادسة لم يقم بنا حتى ذهب شطر الليل - (ابو داؤد - ترمذی، نسائی - ابن ماجة)

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزے رکھے تو کسی رات بھی تراویح پڑھنے کو ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ سات رات باقی رہ گئے تو آپ نے رات یعنی چوبیسویں رات ہمیں تراویح کی نماز ثلث رات تک پڑھائی پھر پچیسویں رات پڑھائی، پھر جب چھبیسویں رات آئی تو نصف شب نماز تراویح پڑھائی۔ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تراویح پڑھنے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اس لیے اس امر کے ثبوت کے لیے چنداں حاجت نہیں۔ البتہ آج کل اس مسئلہ میں ایک طرز سے بحث پیدا ہو گئی ہے۔ جس طرح ہمارے حنفی بھائی رفع یدین کی نسبت معتقد ہیں کہ آنحضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین تو کی ہے مگر پھر منسوخ ہو گئی تھی۔ اسی طرح آج کل ایک آدھ کا خیال ہے کہ تراویح تو حضور نے پڑھی ہیں۔ مگر پھر جب لوگوں کو گھروں میں چلے جانے کا حکم صادر فرمایا تو نماز تراویح مسجد میں باجماعت

پڑھنی منسوخ ہو گئی۔ تو ایسے صاحبوں سے فیصلہ آسان ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ[1] علیہ وسلم کا فعل تو اُن کو بھی مسلّم ہے۔ رہا منع کا دعویٰ سو دلیل کا محتاج ہے، آپ اس مسئلہ پر اُس حدیث کو دلیل لاتے ہیں جو خوش قسمتی سے اُن کے مخالف لایا کرتے ہیں۔ بخاری مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے جس کا مضمون ہے کہ صحابہ نے چند روز حضور اقدس کی اقتدا میں نماز پڑھی تو آخر حضورؐ اپنے حجرہ سے باہر نہ نکلے اور فرمایا:
خشیت ان یکتب علیکم ولو کتب علیکم ما قمتم بہٖ فصلوا ایھا النّاس فی بیوتکم فان افضل صلوٰۃ المرء فی بیتہ الّا المکتوبۃ یعنی مجھے خوف ہے کہ تم پر یہ نماز فرض نہ ہو جائے اگر فرض ہو گئی تو تم اس کو نباہ نہ سکو گے پس تم گھروں میں نماز پڑھو پس صاف معلوم ہُوا کہ قیام لیل با جماعت مسجد میں منسوخ ہے۔

اس کے جوابات تو کئی طرح سے ہو سکتے ہیں، مگر جن صاحب سے ہمارا روئے سخن ہے چونکہ اُن سے ہمیں ذاتی طور پر بھی نیاز حاصل ہے جس سے ہم اُن کی طبیعت سے واقف ہیں اس لیے صرف ایک ہی جواب جو اُن کی طبیعت کے مناسب ہے، دیتے ہیں کہ جس نماز کی سنیت کے ہم مُدعی ہیں اُس کا یہاں کوئی ذکر نہیں، یہ حدیث نماز تہجد کے متعلق ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں صاف لفظ ہیں خرج لیلۃ من جوف اللیل (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نصف رات کو نکلے اور نماز پڑھی

---

[1] : دیکھو رسالہ البیان الصریح لاثبات کراھۃ التراویح مؤلفہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی صفحہ ۲۶ اس رسالہ کا مصنف اب خود اس رسالہ کو غلط جانتا ہے کیونکہ رسالہ مذکورہ میں احادیث کے مضامین پر بحث ہے، مگر اب تو مصنف یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ احادیث کو معاذ اللہ شیطانی خیالات کہتا ہے۔ (علیہ ما یستحقہ)

تو چند لوگوں نے آپ کے ساتھ اقتدا کیا۔ آہستہ آہستہ سب کو خبر ہو گئی کہ حضور رات کو جماعت کراتے ہیں یہاں تک کہ لوگوں کا اتنا ازدحام ہوا کہ مسجد میں نہ سما سکتے تھے۔ چوتھی رات آپ تشریف نہ لائے تو صحابہ کی خواہش پر آپ نے وہ ارشاد فرمایا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس حدیث سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نماز تہجد کے باجماعت مسجد میں ادا کرنے سے منع فرمایا ہے جس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرما دی کہ مجھے اس کی فرضیت کا خوف ہے۔ جسے ہمارے دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا دعویٰ تو اوّل شب کی جماعت کے سنّت ہونے کا ہے جس کے ثبوت میں ہم نے حدیث بھی نقل کی ہے جو ان صاحب کو بھی مسلّم ہے۔ پس ایسے ویسے احتمالات سے اگر نسخ ثابت ہوگا تو کوئی مسئلہ شریعت کا ثبوت نہ ہوگا۔ ایسے صاف اور صحیح جواب کو پا کر بھی ان مولوی صاحب نے قبول نہیں کیا بلکہ اس کے جواب میں بہت کچھ کوشش کی ہے جس ساری کوشش کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے وقت کی نماز اور پچھلے وقت کی ایک ہی ہے۔ دو نہیں۔ یعنی تراویح جو اوّل وقت پڑھی جاتی ہیں تہجد کی نماز ہے اور کوئی نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس دعویٰ پر بھی کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے خلاف دلیل موجود ہے۔ کیونکہ تہجد کے معنی نیند سے اٹھ کر نماز کا پڑھنا قاموس میں ہے۔ تھجد استیقظ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وعن ابیہا کی حدیث سے جو ذیل میں درج ہے۔ یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اوّل شب کی نماز اور آخر شب کی ایک ہی ہے بلکہ اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ :۔

ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ   آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعتیں

وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ — ہی رمضان اور غیر رمضان میں پڑھتے تھے۔

رہی یہ بات کہ جن تین دنوں میں آپ نے اوّل شب تراویح پڑھی تھیں، ان دنوں میں آخر شب بھی نماز پڑھی ہو گی، یہ تو گیارہ رکعت سے زیادہ ہو گئیں اور اگر نہیں پڑھی ہو گی تو فرمانِ خداوندی فتہجّد کی تعمیل نہ ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں صورتیں ممکن ہیں یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے ان دنوں میں نماز تہجّد پڑھی ہو مگر چونکہ تمام عمر کے لحاظ سے تین دن کی مقدار ایسی قلیل ہے کہ جس کی کوئی نسبت ہی نہیں ملتی اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عام طور پر نفی کر دی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے کبھی زیادہ نہیں پڑھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان تین دنوں میں حضورؐ نے اسی اوّل شب کی نماز کو قائم مقام پہلی رات کی نماز کے کر کے نہ پڑھی ہو لیکن کسی نماز کا دوسری نماز کے قائم مقام ثواب میں ہو جانے سے ان دونوں کا ایک ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھو جمعہ ظہر کے قائم مقام ہے مگر دونوں ایک نہیں، جمعہ کے واسطے کئی ایک شرائط[1] ایسی ہیں جو ظہر کے لیے نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح اوّل رات تین روز پڑھی ہے جس سے اس فعل کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ نسخ ثابت نہیں۔ اس لیے تراویح کا اوّل شب پڑھنا یا مسنون سنت ہے۔ رہا تعداد رکعت کا سوال سو اس میں اہلحدیث کا کسی سے اختلاف نہیں کیونکہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے تراویح مع وتر گیارہ رکعتیں پڑھی ہیں۔ بیس پڑھنے

---

[1] شرائط شرعیہ مراد ہیں نہ کہ خود ساختہ (ن)

کی روایت آنحضرت سے جو آئی ہے خود محققین حنفیہ نے اس کو ضعیف کہا ہے شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس روایت کی بابت لکھا ہے متفق علی ضعفہا مع مخالفتہ للصحیح (یعنی اس کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اجماع ہے، باوجود اس اجماع کے وہ صحیح روایت یعنی گیارہ رکعت والی کے خلاف ہے) ہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس رکعتوں کا ثبوت یزید بن رومان کی روایت سے ثابت ہوتا ہے سو اگر وہ روایت صحیح ہو تو بھی ہمارے مذہب کے خلاف نہیں کیونکہ ہمارا مذہب یہ نہیں کہ بیس رکعت حرام ہیں بلکہ یہ ہے کہ آٹھ رکعتیں معہ وتر گیارہ بوجہ اس کے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے سنت ہیں اور بیس رکعتیں درصورت ثبوت کے مستحب ہیں کیونکہ صحابہؓ نے پڑھی ہیں یہی حنفیہ کا مذہب ہے، چنانچہ شیخ ابن الہمام حنفی فتح القدیر حاشیہ ہدایہ میں لکھتے ہیں :-

فحصل من ھذا کلہ ان قیام رمضان سنۃ احدی عشر رکعۃ بالوتر فی جماعۃ فعلہ علیہ السلام ثم ترکہ لعذر وکونہا عشرین سنۃ الخلفاء الراشدین۔	قیام رمضان میں سنت تو گیارہ ہی رکعتیں ہیں جو آنحضرتؐ نے پڑھی ہیں اور بیس ۲۰ خلفاء کا فعل ہے۔ (فتح القدیر)

چونکہ ہم ہر ایک امر میں عدل کرنے کے لیے مامور ہیں، اس لیے پیغمبر علیہ السلام کے فعل اور رتبہ کے برابر کسی کے فعل اور رتبہ کو مساوی جاننا بے ادبی سمجھتے ہیں اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ گیارہ رکعتیں تو سنت ہیں ہاں اگر کسی سے ہو سکے کہ باطمینان نماز بیس پڑھے تو آٹھ سے زیادہ نوافل کے حکم میں ہو کر موجب ثواب ہوں گی، لیکن جس طریق سے ہمارے بھائی بیس پڑھتے ہیں کہ نہ تو

قاری کی قرأت تنزیل ہوتی ہے نہ رکوع و سجود و اطمینان ہوتا ہے، نہ قعدہ و قومہ درست۔ سو اس کا فیصلہ وہ خود کرلیں۔

ع محتسب را درون خانہ چہ کار؟

ایک مجلس میں تین طلاقیں

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے جیسا کہ آج کل دستور ہے ایک ہی طلاق ہوتی ہے یعنی عورت مطلقہ خاوند پر حرام نہیں ہوتی بلکہ اگر رجوع کرے تو کرسکتا ہے کیونکہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ :-

کان الطلاق علی عہد رسول	آنحضرت اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بلکہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک بھی تین
وابی بکر وسنتین من	طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ پھر حضرت عمرؓ
خلافۃ عمر طلاق الثلاث	نے لوگوں کی حالت دیکھ کر (کہ ایک ہی مجلس میں
واحدۃ فقال عمر بن	تین طلاقیں دیتے ہیں جو شرع میں ناپسند ہے)
الخطاب ان الناس	کہا کہ لوگوں نے ایک ایسے کام میں جلدی کی
قد استعجلوا فی امر	جس میں شرع کی طرف سے ان کے لئے ڈھیل
کانت لھم فیہ	منظور رکھی گئی تھی اب اگر ہم ان پر یہ حکم جاری
اناۃ فلو امضیناہ	کر دیں تو مناسب ہے پس انہوں نے جاری
علیھم فامضاہ علیھم۔	کر دیا کہ جو کوئی ایک مجلس میں تین طلاقیں دے
(مسلم)	گا وہ تین ہی شمار ہوں گی (مسلم)

اہلحدیث کا دعویٰ ہے کہ یہ حدیث صاف دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہدایت مہد میں لوگ تین طلاقیں اگر ایک مجلس میں دیتے تھے تو ایک ہی گنی جاتی تھی۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ایسے عظیم احکام اپنے پاس سے ایجاد نہ کیا کرتے تھے بلکہ آنحضرتؐ کے ارشاد سے کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی یہ حکم بدستور رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک بھی یہی حکم تھا، پھر جو لوگوں نے ایک ہی مجلس میں متعدد طلاقیں دینے کی عادت کر لی جو اگرچہ ایک ہی شمار ہوتی تھیں مگر شرع شریف میں متعدد طلاقیں ایک ہی مجلس میں دینی ناپسند کی گئی تھیں اس لیے حضرت عمرؓ نے لوگوں کو روکنے کے لیے یہ حکم جاری کر دیا کہ جو کوئی تین طلاقیں دے گا تین ہی شمار ہوں گی۔ جس سے یہ غرض تھی کہ یہ لوگ یہ دھمکی سن کر ایسی ناشائستہ حرکت سے باز آ جائیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کیا تمام دنیا میں بھی سوائے پیغمبر علیہ السلام کے کسی کو منصب شریعت نہیں۔ چنانچہ ہم اسی رسالہ میں اس مسئلہ پر مفصل[1] بحث کر آئے ہیں۔ پس اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم شرعی ہے؟ کچھ شک نہیں کہ شرعی یعنی ایسا نہیں کہ یہ حکم شریعت کا مسئلہ قرار دیا جائے بلکہ ایک سیاسی حکم ہے جو حاکم وقت کسی مصلحت سے یا کسی بدنظمی کے بند کرنے کو جاری کرے یا کوئی سزا بڑھا دے جیسے حنفیوں کے نزدیک زانی کو جلا وطن کرنا جو صریح حدیثوں میں آتا ہے حدِ زنا سے زائد سیاسی حکم ہے شرعی نہیں یعنی حاکم کی طرف سے بغرض دفع فساد ہے جو فساد عظیم اگر نہ ہو تو اس کا کرنا بھی چنداں ضروری نہیں۔

اسی حدیث کی تائید آیت قرآنی سے بھی ہوتی ہے جس میں طلاق کا ذکر ہے

---

[1] : پچھلے صفحات پر بذیل بحث تقلید شخصی ملاحظہ ہو۔

ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (یعنی طلاق رجعی دو دفعہ ہے پھر اس کے بعد یا تو خاوند روک لے یا احسان اور سلوک سے چھوڑ دے) اس آیت میں صاف مذکور ہے کہ دو طلاقوں کے بعد خاوند کو دو باتوں میں ایک کر لینے کا اختیار ہے یعنی وہ عورت کو روک بھی سکتا ہے اور چھوڑ بھی سکتا ہے لیکن بصورت تین طلاقوں کو تین کہنے کے یہ اختیار نہیں رکھ سکتا کیونکہ جب کسی شخص نے ایک ہی مجلس میں انت طالق ثلاثا (تجھے تین طلاق) کہہ دیا اور تینوں نے اس پر واقع ہو کر عورت کو مغلظہ یعنی حرام کر دیا تو ایسا وقت تو کوئی نہ نکلا جس میں خاوند کو اختیار ہو کہ اس کو رکھ سکے کیونکہ لفظ تو ایک ہی دفعہ منہ سے نکلا ہے۔

گو یہ تقریر اس صورت میں منطبق نہ ہو جس میں انت طالق۔ انت طالق۔ انت طالق (تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق) الگ الگ کہے مگر چونکہ تین کے قائلین دونوں میں برابر حکم لگاتے ہیں اس لیے یہ آیت فی الجملہ ہمارے مؤید اور ان کی تردید کرتی ہے۔

اس مسلم والی حدیث سے جس کو ہم نے نقل کیا ہے اُن تمام حدیثوں اور روایتوں کا جواب ہو سکتا ہے جو تین کے ثبوت کے لیے پیش کی جاتی ہیں جن میں سے بعض تو اماموں دین اور صحابہ کے اقوال ہیں جو مرفوع حدیث نبوی کے مقابلہ پر جب تو کیا پیش کرنا ہی بے ادبی ہے اور بعض مرفوع احادیث بھی ہیں لیکن نہ تو صحت میں اس حدیث کے برابر ہیں اور نہ ہی دلالت میں۔ یہ حدیث صحت میں پکی ہے اور اس کی دلالت عبارت النص ہے جو تمام قسم کی دلالتوں سے مقدم ہے۔

اس حدیث پر اور تو جو کچھ سوالات وارد ہوتے تھے وہ تھے ہی لیکن فاضل ہمارے مصنف التغابات نے جو سوال کیا ہے وہ بیشک اس قابل ہے کہ ہمارا

نقل کیا جائے وُہ یہ ہے :-

"اس حدیث میں تو مطلقًا تین طلاق کو ایک شمار کرنے کا واقعہ مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے تین طلاق بفم واحد یا بجلسۂ واحد یا جلسات متفرق دینے کو لوگ ایک شمار کرتے تھے تین برس خلافت تک حضرت عمرؓ کی تو طلاق مغلظ کی بیخ و بنیاد ہی کٹ جاتی ہے، طلاق مغلظہ کوئی باقی نہیں رہتی ہے اور جب تک اس حدیث مذکورہ سے صاف لفظوں میں لفظ فم واحد یا جلسۂ واحد یا رجعی کا بتلایا نہیں جائے گا۔ دلیل دعویٰ کے ساتھ منطبق نہ ہوگی۔ دلیل عام سے دعویٰ خاص ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ تین طلاق بفم واحد یا بجلسۂ واحد ایک رجعی ہوگی اور دلیل یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ ایک طلاق ہوتی تھی ہرگز دلیل عام سے نتیجہ خاص نہیں نکلنے کا۔ ہاں اگر اس دلیل کو خاص کر دیجیے اور الفاظ محذوف و مقدر مان کر زبردستی نتیجہ خاص نکالنے پر کوئی آستین چڑھائے تو اس کا جواب کیا ہے مگر اہلِ بصیرت کے نزدیک دلیل کافی نہ ہوگی" (صفحہ ۴۶)

پورا مطلب اس عبارت کا تو مصنف موصوف ہی نے سمجھا ہوگا۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ رہنمائی کرتی ہے ہم یہ سمجھتے کہ آپ کو اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کونسی تین طلاقیں آنحضرتؐ کے زمانے میں ایک شمار ہوتی تھیں یعنی انت طالق ثلاثًا والیں یا انت طالق۔ انت طالق۔ انت طالق والیں یا تین طہروں والیں جو الگ الگ دی جاتی تھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تیسری شق چھوڑ کر باقی دونوں صورتوں والیں کیونکہ تیسری شق یعنی ایسی صورت میں تین طلاقیں جو الگ الگ طہروں

میں دی جائیں یہ تو قرآن مجید کی صریح آیت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ پھر ان کو بھی حدیث مذکورہ میں داخل کرنا یا داخل سمجھنا گویا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جناب میں بلکہ خود سرور کائنات کے حضور میں بے ادبی ہے کیونکہ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ انہوں نے اس حکم قرآنی کو نہیں سمجھا تھا، بلکہ تمام عمر اس کے خلاف کرکے طلاق مغلظہ کی بیخ و بنیاد ہی اٹھادی تھی۔ اگر حضرت عمرؓ توجہ نہ کرتے تو شاید طلاق مغلظہ جو قرآن شریف میں موجود تھی دنیا میں وجود پذیر ہی نہ ہوتی (چہ خوش) حالانکہ حضرت عمرؓ خود قائل ہیں کہ لوگوں نے ایک ایسے امر میں جلدی کی ہے جس میں اُن کے لیے ڈھیل مدنظر رکھی گئی تھی یعنی تین طلاقیں متفرق طور پر واقع کرنے کا اُن کو حکم تھا جو یہ ایک ہی مجلس میں دے دیتے ہیں۔

علاوہ اس کے مصنف موصوف کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ دلیل عام سے دعویٰ خاص ثابت نہیں ہوتا کیونکہ عام کے دو معنی ہیں ایک معقولی عام ہوتا ہے جسے کلی کہتے ہیں۔ ایک اصولی عام ہوتا ہے۔ معقولی عام سے تو مخصوص جزئی کا تحقق ضروری نہیں۔ مگر اصولی عام مستلزم خاص کو ہوتا ہے۔ خاص کر حنفیوں کے مذہب میں جو عام اور خاص کو دلالت میں مساوی الاقدام مانتے ہیں یہاں اگر عام ہے تو اصولی عام ہے جو خاص کو مستلزم ہے جیسا کہ اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ زید مشرک کو بھی شامل ہے۔ فافہم ولا تعجل

اسی قسم کے اور بھی کئی ایک سوال ہیں جن کے جوابات مع مزید تحقیق اس مسئلہ کے زاد المعاد اور نیل الاوطار وغیرہ میں مل سکتے ہیں۔ رسالہ ہذا کے مناسب شان حسب قدر تھا وہ ادا کیا گیا۔

مفقود الخبر کی بیوی کا حکم

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ مفقود الخبر (جس کی کوئی خبر نہ ہو کہ کہاں ہے یا مردہ) اُس کی بیوی چار سال کے بعد چار ماہ دس دن عدّت گذار کر نکاح ثانی کر لے، یہی مذہب امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہی حکم صادر فرمایا تھا۔ چنانچہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے اس کو ان لفظوں میں روایت کیا ہے :-

امرأة المفقود تربص اربع سنین ثم تعتد اربعة اشهر وعشرا

یعنی مفقود الخبر کی بیوی چار سال کے بعد چار ماہ دس روز عدّت گذار کر نکاح کر لے۔

جمہور حنفیہ اس کے خلاف ہیں پھر ان میں کوئی تو اس کی میعاد نوّے برس بتلاتا ہے کوئی ایک سو بیس برس، کوئی کہتا ہے کہ جب اس کے خاوند کے ہم عمر عموماً مر جاویں تو نکاح کرے۔ مگر اس مسئلہ کی قوّتِ ثبوت اور عورتِ مذکورہ کی قابلِ رحم حالت نے بہت سے محققینِ حنفیہ کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ اہلحدیث وغیرہ کے ہم صفیر اور متفق الرّائے ہوں۔

صاحب درالمختار جو فقہ حنفیہ میں ایک مشہور اور معتبر فتاویٰ ہے باب المفقود میں صاف اقراری ہیں کہ امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا جاوے، ہندوستان کے علماء حنفیہ کے فخر مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی مرحوم نے تو بڑے ہی زور سے اس بات کا اظہار کیا ہے چونکہ آپ کی ساری تقریر دلپذیر ہے اس لیے شرح وقایہ کے حاشیہ عمدۃ الرّعایہ سے نقل کی جاتی ہے۔

مولوی صاحب موصوف بعد ذکر کرنے دلائل فریقین کے اور قابلِ رد کو

رد کرنے کے فرماتے ہیں :-

وبعد اللتيا والتي نقول قد صرح جمع من اصحابنا كصاحب جامع الرموز وصاحب در المنتقي شرح الملتقي وصاحب رد المحتار وغيرهم بانه لو افتى حنفي في هذه المسئلة بقول مالك عند الضرورة لا باس به وعلى هذا على حيث افتيت غير مرة بقول مالك لما مني انه قوي من حيث الدليل ومع قطع النظر عنه تقليد مذهب الغير جائز عند الضرورة اتفاقا ولست بمتفرد في ذلك بل وافقت فيه جمعا من الحنفية ولقد عارضني فيه جميع من افاضل عصري فدفعت شبهات بعضهم وسكت عن جواب بعضهم علما مني انهم لم يصلوا الى ما وصلت منهم

ہمارے اصحاب (حنفیوں) میں سے ایک جماعت جیسے مصنّف جامع الرموز اور مصنّف در المنتقی اور مصنّف رد المحتار وغیرہ نے صاف لکھا ہے کہ اس مسئلہ (مفقود الخبر) میں اگر امام مالکؒ کے مذہب پر ضرورت کے وقت فتویٰ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں پھر فرماتے ہیں میرا عمل بھی اسی پر ہے، میں نے کئی ایک دفعہ امام مالکؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی دلیل قوی ہے اور قطع نظر اس کے غیر امام کے مذاہب کی تقلید ضرورت کے وقت سب کے نزدیک جائز ہے۔ پھر فرماتے ہیں میں ہی تو اس میں اکیلا نہیں بلکہ حنفیوں میں ایک جماعت ہے جس کے ساتھ موافق ہے پھر فرماتے ہیں میرے زمانے کے بعض علماء نے اس امر میں مجھ سے کچھ تکرار کی تو میں نے بعض کے شبہات تو رفع کر دیئے اور بعض سے میں خود ہی خاموش رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کا مبلغ علم اتنا نہیں ہے

معذورون فی ما ذهبوا الیہ والتعصب مغمورون۔ (عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ)	یہ وہاں تک نہیں پہنچے جہاں تک میں پہنچا ہوں پس وہ معذور ہیں اور تقلید کے بھنور میں گرفتار۔

اہلحدیث کے خلاف ایک حدیث اور ایک قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقل کیا جاسکتا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: امرأۃ المفقود امرأتہا حتی یاتیہا البیان (یعنی مفقود الخبر کی عورت کو جب تک خاوند کی موت کی خبر آئے اسی کی عورت ہے)، یعنی نکاح ثانی نہیں کرسکتی۔ مگر اس حدیث کو تمام محدثین نے ضعیف بلکہ اضعف کہا ہے (دیکھو تخریجات ہدایہ زیلعی وعسقلانی وغیرہ) اور حضرت علیؓ کے قول کا جواب یہ ہے کہ اول تو ایسے مسائلِ اجتہادیہ میں صحابی کا قول جو قیاس کے موافق ہو حجت نہیں خاص کر ایسی صورت میں کہ خلیفہ دوم جیسے جلیل القدر صحابی کا فیصلہ اس کے خلاف ہو۔ دوم یہ کہ حضرت علیؓ نے خود اس قول سے رجوع کیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر عمل کیا ہے (دیکھو زرقانی شرح مؤطا)

علاوہ اس کے علمی طور سے اس پر ایک سخت اعتراض وارد ہوتا ہے جو مولانا عبدالحی مرحوم کے لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ومما یرد فی ھذا المقام علی اصحابنا ان قول الصحابی فیما لا یعقل بالرای فی حکم المرفوع فیقدم علی غیرہ ومن	ہمارے اصحاب (حنفیوں) پر اعتراض ہے کہ صحابی کا قول کسی ایسے امر میں جو نقل اور اجتہاد سے نہ سمجھا جائے بلکہ شریعت کی تفہیم پر موقوف ہو حکماً مرفوع ہوتا ہے یعنی اُس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا ہے

المعلوم ان اثر عمر وغیرہ یخالف القیاس فیکون مرفوعا حکما فلا بد ان یؤخذ به ویقدم علی الآثار الموافقة للقیاس وعلی القیاس ۔
(حاشیہ شرح وقایہ)
(کتاب المفقود)

پس وہ دوسرے اقوال پر (جو ایسے نہ ہوں یعنی قیاس کے موافق ہوں یا قیاس سے سمجھے جا سکتے ہوں) مقدم کیا جاوے گا جب یہ اصول مقرر ہے تو اس میں تو شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کا قول (کہ مفقود الخبر کی عورت چار سال تک انتظار کرے) قیاس کے خلاف ہے، جو یقیناً مرفوع کے حکم میں ہوگا پس واجب ہے کہ اسی پر عمل کیا جائے اور جو اقوال صحابہؓ کے اس بارے میں قیاس کے موافق ہیں (کہ عورت مذکورہ ہمیشہ اس کی بیوی ہے) ان کو بھی اور قیاس کو بھی چھوڑ دیا جائے ۔

ہندوستان کے فخر الحنفیہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب مرحوم گنگوہی کا بھی یہی فتویٰ ہے جو درج ذیل ہے (یہ فتویٰ کارڈ پر ہمارے پاس ہر روز موجود ہے)

فتویٰ :- زوجہ مفقود الخبر کے بارے میں بہتیرے علماء حنفیہ نے بوجہ ضرورت امام مالکؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور عمل کیا ہے اور بندہ بھی بنا بر ضرورت اس مذہب پر عمل کرنا جائز جانتا ہے ۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم
بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

یہی مذہب اہلحدیث کا ہے ۔ خدا مولوی صاحبان مرحومین کو اس رحم کی جزا خیر دے جو انہوں نے اس بے کس اور مظلوم عورت پر کیا ۔ آیندہ بھی جو علماء اس میں شریک ہوں ان پر خدا تعالیٰ رحم کرے ۔ یرحم اللہ عبداً قال آمینا ۔

اہلحدیث کیوں اہلحدیث ہیں؟

اہلحدیث کا لقب چونکہ پسندیدہ ہے اس لیے ہمارے بھائی مقلدین اس لفظ کے سنتے ہی کہا کرتے ہیں کہ کیا ہم اہلحدیث نہیں ؟ تم ہی اہلحدیث ہو ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن معنی سے اہلحدیث اپنا نام اہلحدیث رکھتے ہیں اُن معنے سے مقلدین اہلحدیث نہیں ہیں، وُہ کیا ہے ؟ وُہ یہ ہے کہ اہلحدیث اور مقلدین کے طریق عمل بالحدیث الگ الگ ہیں۔ اہلحدیث تو موجب اصول مسلّمہ حدیث کو دوم درجہ قرآن ؎ سمجھ کر بعد قرآن شریف کے تلاش مسائل کے وقت پہلی نظر حدیث پر ڈالتے ہیں۔ پس اگر باقاعدہ حدیث سے وُہ مسئلہ مل گیا تو پھر انہیں اس بات کی پروا نہیں رہتی کہ اس مسئلہ میں کسی کا کیا مذہب ہے اور کسی کا کیا خیال؟ زید کیا کہتا ہے اور عمرو کیا فرماتا ہے بلکہ وہ بے کھٹکا اس پر عمل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فتووں میں مقدم اور حدیث لکھ کر پھر اگر کسی کا قول لکھتے ہیں تو بطور تائید کے لکھتے ہیں نہ بطور اثبات مدعا کے، اُن کے دلائل میں سوائے قرآن حدیث

؎ : مرزا قادیانی اپنے معمولی دروغ بے فروغ سے کام لیتا ہُوا اہلحدیث پر بہتان لگاتا ہے کہ اہلحدیث، حدیث کو قرآن سے مقدم سمجھتے ہیں (دیکھو اس کا رسالہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور عبداللہ چکڑالوی کے مباحثہ پر محاکمہ) یہ بہتان اُس کا کچھ تو اس وجہ سے ہے کہ اُس نے علم حدیث، نہ تو کسی محدث سے پڑھا اور نہ اہلحدیث کے اصول سے واقف ہُوا۔ کچھ اس لیے بھی کہ اہلحدیث ہی اس کی نبوت کی ٹانگ توڑنے کے زیادہ درپے ہیں۔ اللّٰھم اخذل من خذل دینک وانصرنا علیہم یا خیر الناصرین (منہ)

کے اور کچھ نہ ہوگا اور یہی طریقہ تمام سلف صالحین کا تھا مگر ہمارے بھائیوں (مقلدین) کا یہ طریق نہیں بلکہ وہ اپنی دلیل میں اپنے امام کا قول نقل کر کے اکثر تو اسی پر قانع ہو جاتے ہیں اگر کسی مخالف کا خوف ہوا تو اس قول کی نص تائید کے لیے کسی حدیث کی تلاش کریں گے، ملی توفبہا ورنہ اتنا ہی کافی ہے ھی روایۃ عن الامام (یہی روایت امام صاحب سے ہے) اور اگر کوئی حدیث امام کے مذہب کے خلاف پائی تو یہ تو ان سے ہو ہی نہ سکے گا کہ امام کے قول کو بحسن ظن سر دست چھوڑ دیں اور حدیث مصطفیٰ فداہ ابی وامی علیہ التحیۃ والسلام پر عمل کریں نہیں بلکہ سر دست حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بایں تاویل چھوڑ دیں گے کہ خدا جانے یہ حدیث کیسی ہے صحیح ہے یا غیر صحیح پھر اگر صحیح ہے تو منسوخ ہے یا غیر منسوخ وغیر ذلک من العذرات الباردۃ مگر اہلحدیث کو ان باتوں کا خیال تک بھی نہ آئے گا۔ پس ؤہ یہی بنا ہے جس کی وجہ سے اہلحدیث تو اہلحدیث کہلانے کے مستحق ہیں لیکن مقلدین نہیں اور غالباً یہ وجہ بالکل نمایاں ہے جس کی تسلیم میں کسی کو چون وچرا نہ ہوگی۔ میں نے ایک بڑے عالم حنفی سے جو شیخ الکل شمس العلما حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ یہ اپنے کانوں سے سنا کہ ہم لوگ تو حدیث اس لیے پڑھتے ہیں کہ تم لوگ جو ہمیں تنگ کرتے ہو جواب دے سکیں ورنہ عمل کے لیے نہیں کیا حاجت ہے۔ میں نے جب حیرانی سے ان کا یہ کلام سنا تو فرمانے لگے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جب ہم مقلد ہیں تو ہمیں اپنے امام کی تحقیق سے کس کی تحقیق اچھی ہے؟ پس جو کچھ وہ تحقیق کر گئے ہیں ہمارے لیے تو وہی شاہراہ

ہے۔ پس یہی وہ فرق ہے جس پر یہ پیارا نام مبنی ہے ورنہ یوں تو کون ہے جو یہ لقب اپنے حق میں نہ چاہتا ہو۔ ؎

کل یدعی وصلا للیلیٰ[1] و لیلیٰ لا تقر لھم بذاکا

اور اگر کوئی مقلد ایسا ہی سعید ہو کہ ہمیشہ اس بات کی فکر میں رہے کہ کوئی مسئلہ بغیر ثبوت قرآن و حدیث کے نہ مانے اور ہر مسئلہ میں اہلحدیث کی طرح مقدم قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرے، جس مسئلہ کی گواہی یہ دو[2] عادل گواہ دیں اسی کو واجب التسلیم جانے اور جس کی بابت یہ گواہی نہ دیں اُسے متروک سمجھے تو ایسے صاحب بھی اہلحدیث کے محاورے میں اہلحدیث ہی ہیں گو ان کے نام کے ساتھ حنفی، شافعی وغیرہ اُن کی طرف سے یا پچھلوں کی طرف سے ملائے گئے ہوں لیکن قلیل ما ھم۔

اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اہلحدیث کی غرض و غایت گروہ بندی سے نہیں تھی اور نہ ہے بلکہ اُن کا دائرہ ایسا وسیع ہے کہ ہر ایک محقق کو شامل ہے جو شخص اپنی تحقیق کا مدار آزادانہ قرآن و حدیث پر رکھے وہ اہلحدیث ہے گو اس کی تحقیق کسی مسئلہ میں کسی امام یا محدث کی رائے کے خلاف بھی کیوں نہ ہو جو لوگ اہلحدیث کہلا کر اپنی یا کسی دوسرے کی تحقیق کو کسی دائرہ میں محدود کرتے ہیں اُن کی رائے صحیح نہیں بلکہ حجرت واسعا کی مصداق ہے فافھم۔ اس مسئلہ کی مفصل بحث دیکھنی ہو تو حضرت حجۃ الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں باب الفرق بین اہلحدیث و اصحاب الرائے دیکھو۔

---

[1] : ہر ایک لیلیٰ کے وصال کا دعویدار ہے مگر لیلیٰ کسی کے حق میں اقراری نہیں ہے (منہ)

علاوہ اس کے وجہ تسمیہ میں اطراد ضروری نہیں فتفکروا یا ذوی الابصار۔

اہلحدیث کے مذہب کا بانی کون ہے؟

اہلحدیث کے مذہب کے بانی سید الانبیاء محمد مصطفےٰ

احمد مجتبیٰ فخر آدم افتخار بنی آدم فداہ ابی و امی علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام ہیں
چنانچہ اہلحدیث کے مسائل دیکھنے والوں پر یہ امر ذرہ بھر مخفی نہ ہوگا کہ اہلحدیث ہر ایک
مسئلہ پر قرآن شریف کی آیت یا حضور پر نور اقدس کی حدیث ہی سے مقام استدلال
کرتے ہیں۔ جہلا میں مشہور ہے کہ اہلحدیث کے مذہب کا بانی عبدالوہاب نجدی ہوا
ہے۔ مگر حاشا و کلا ہمیں اُس سے کوئی بھی نسبت نہیں، یہ تو صاف بات ہے کہ
ہر ایک فرقہ اپنے اپنے بانی مذہب کے اقوال اپنے فتاووں میں نقل کیا کرتے ہیں چنانچہ
بھائی حنفیہ، شافعیہ، امامیہ وغیرہم کے طریق عمل اس امر پر شاہد عادل ہیں لیکن آج
تک کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ اہلحدیث نے کبھی بھولے سے بھی عبدالوہاب نجدی کے
اقوال کو سنداً پیش کیا ہو اور کہا ہو کہ ھٰذا قول امامنا عبدالوہاب وبہ
ناخذ (یہ قول ہمارے امام عبدالوہاب کا ہے) بلکہ اہلحدیث کے بہت سے
افراد کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عبدالوہاب کون تھا، اس کی بود و باش کیا تھی ہاں تاریخوں
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بھائیوں کی طرح وہ بھی ایک مقلد تھا، چنانچہ رسالہ
جواہر الایقان مطبوعہ افضل المطابع دہلی کے مصنف کو باوجودیکہ اہلحدیث سے سخت
للّٰہی بغض ہے ایسا کہ بات بات میں اُن پر متعدد افترا اور اتہام لگائے ہیں اور
سطر سطر میں اُن کا نام وہابی اور نجدی رکھا ہے تاہم اس امر کے اقراری ہیں کہ
عبدالوہاب نجدی حنبلی مذہب کا مقلد تھا (دیکھو رسالہ مذکورہ صفحہ ۱۱ سطر ۴)

اور رد المختار باب البغات میں صاف لکھا ہے (کا نوا ذای عبد الوہاب و اتباعہ) ینتحلون مذہب الحنابلۃ یعنی عبد الوہاب نجدی اور اس کے اتباع حنبلی مذہب کی تقلید کرتے تھے"۔ مولانا رشید احمد صاحب حنفی گنگوہی کے فتاوی رشیدیہ مطبوعہ مراد آباد کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے کہ "عبد الوہاب نجدی بڑا خوش اعتقاد تھا اور حنبلی مذہب کا مقلد تھا"۔ اور ہمارے نزدیک تقلید کا وہی حال ہے جو ہم اس رسالے میں لکھ آئے ہیں۔ پس باوجود اس بے تعلقی کے ہم کو عبد الوہاب کے پیرو یا اس کو ہمارے مذہب کا بانی بتلانا صریح جھوٹ اور دل آزاری نہیں تو کیا ہے؟ دراصل یہ ناپسندیدہ القاب اسی عشق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کرشمے ہیں جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عرب کے لوگوں سے "صابی" کا لقب دلایا تھا۔ آہ سہ

بجرم عشق تو ام مے کشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ عجب تماشائیست

خلاصہ مذہب اہلحدیث

اہلحدیث کے مذہب کا خلاصہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی جو تعلیم سید الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ قرآن شریف اور احادیث صحیحہ کے مخلوق کو فرمائی ہے اس کا اتباع کرنا ہمارا مذہب ہے اور بس سہ

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

سرکاری دفتروں میں اہلحدیث کو وہابی کہنے کی ممانعت

بعض دوست دریافت کیا کرتے ہیں کہ اہل حدیث کو وہابی کہنے کی ممانعت کب ہوئی تھی اور اس کا کیا ثبوت ہے ؟ اس لیے عام اطلاع کے لیے لکھا جاتا ہے کہ، اہل حدیث کو سرکاری دفتروں میں وہابی لکھنے کی ممانعت ہے ۔ ملاحظہ ہو چٹھی گورنر ہند بنام گورنمنٹ پنجاب مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۸۶ء نمبری ۱۷۵۸

اتباعِ حدیث کی تاکید از مولوی خرّم علی مرحوم

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے؟ — دردانۂ درجِ مصطفٰے ہے !
صوفی و عالم، حکیم دینی ! — کرتے رہے اسی کی خوشہ چینی
باباکے ہاں سے کون لایا ؟ — جس نے پایا یہیں سے پایا
یہ شاہرہِ محمّدی ہے — گنجینۂ رازِ احمدی ہے
مشعل افروزِ راہِ سنت — برہم زنِ بیخ و شاخِ بدعت
ہوتے ہوئے مصطفٰے کی گفتار — مت دیکھ کسی کا قول و کردار
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے؟ — یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے؟
اب زیادہ تو مجھ سے کر نہ کل کل — خورشید کے آگے کیا ہے مشعل؟
بالفرض فلاں ہے مردِ کامل، — اس نے تھا کیا کہاں سے حاصل؟

وہ بھی اسی در کا اک گدا تھا　　گو غوث و امام و مقتدا تھا
مکتوب بہت ہیں تو نے دیکھے　　ملفوظِ محمدی کو اب لے
ناحق تجھے اور کچھ ہوس ہے　　قرآن و حدیث تجھ کو بس ہے
حق ہو گا حدیث خواں سے خُرّم
اور شاد رسولِ فخرِ عالم

محدّثینِ کرامؒ

گروہ ایک جویا تھا علمِ نبیؐ کا　　لگایا پتہ جس نے ہر مُفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ خفی کا　　کیا قافیہ تنگ ہر مُدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو　　اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو　　لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزہ اس کا چکھ کر

(حالی)

اسلام

اور

اہلِ حدیث

از افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ

شائع کردہ

ادارہ اشاعۃ السنۃ

زیر اہتمام: مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان صدر دفتر

حدیث منزل، ۷۔ ایبک روڈ انارکلی لاہور

اسلام کی مختصر تاریخ

پہلے اس سے کہ ہم یہ بتادیں کہ فرقہ بندی کس طرف سے ہے اسلام کی مختصر سی تاریخ بیان کر دینا مفید ہو گا۔

کچھ شک نہیں کہ اسلام کی تاریخ دنیا میں روشن ہے، اس کے ابتدائی، درمیانی اور آخری واقعات سب روشن ہیں۔ اس کا سنہ ہجری ۱۳۳۵[1] ہجری ہے، مگر ابتدا کو ۱۳۴۸ سال ہوئے ہیں جب کہ مکہ معظمہ میں اس کی تعلیم بزبان ترجمان الہام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاری ہوئی تھی۔ تیرہ سال قبلِ ہجرت مکہ معظمہ میں گزارے، دس سال بعد ہجرت مدینہ میں رہے۔ کل ۲۳ سال آپ کی نبوت کا آفتاب دنیا میں ظہور پذیر رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اتنی مدت میں جو تعلیم آپؐ نے دی اس کا کیا اثر ہوا؟ جواب صرف یہ ہے کہ جس پر کُل دنیا کی تاریخ متفق ہے کہ عرب تمام صاف ہو گیا۔ جو مشرک، کافر، ملحد اور زندیق تھے وہ سب خدا کے پرستار بن گئے، جو لٹیرے اور ڈاکو تھے، وہ مدبران سلطنت ہو کر تمدنی تعلیم میں دنیا کے استاد مانے گئے۔

اس پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اُن کو مذہبی احکام کا دستور العمل کوئی دیا تھا یا نہیں؟۔ اس کا جواب

---

[1] اس سنہ میں حضرت ثناء مرحوم نے یہ مقالہ لکھا تھا۔ ۱۲

بھی بالکل صاف اور صحیح یہ ہے اور صرف یہی ہے کہ دیا تھا، اور نہ دیا ہوتا تو وہ لوگ باوجود ضروریات کثیرہ کے تعمیل کیونکر کرتے؟

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں دستورالعمل کیا تھا؟ یعنی وہ احکامِ شرعیہ کہاں سے اخذ کرتے تھے؟ اس کا جواب بھی ایک اور صرف یہ ہے کہ احکام شرعیہ اخذ کرنے کا طریقہ ان میں یہ تھا کہ پہلے قرآن مجید کو دیکھتے، ساتھ ہی اس کے اگر کوئی روایت انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوتی یا کوئی فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھا یا سنا ہوتا تو اس کو بھی ملحوظ رکھ کر بطور سندِ شرعی کے پیش کرتے، چنانچہ سب سے پہلا اختلاف جو صحابہ کرام میں پیدا ہوا وہ انتخابِ خلیفہ پر تھا، انصارِ مدینہ یہ کہتے تھے کہ خلیفہ ہم میں سے ہوگا۔ اس اختلاف کا فیصلہ یوں ہوا کہ مہاجرین کی طرف سے ایک حدیث پیش کی گئی جس کے الفاظ یہ تھے:

اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ — خلیفہ قریش سے ہوں گے۔

یہ حدیث پیش ہوتے ہی فیصلہ مہاجرین کے حق میں ہو گیا۔

دوسرا اختلاف وراثتِ نبی (علیہ السلام) کے متعلق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں نے خلیفہ کے پاس دعوٰے پیش کیا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں سے حصہ ملنا چاہیے جیسے دوسرے مسلمانوں کے وارث حصہ پاتے ہیں۔ خلیفہ کی طرف سے اس کا جواب نفی میں ملا تو اختلاف پیدا ہوا۔ آخر

جب حدیثِ نبویؐ پیش ہوئی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ:

"ہمارا مال ورثہ نہیں ہوگا بلکہ فی سبیل اللہ صدقہ ہوگا"

تو نزاع ختم ہو گئی۔

"تاریخِ اسلام کا کسی اور واقعہ پر اتفاق ہو یا نہ مگر اس امر کا پورا اتفاق ہے کہ زمانۂ رسالت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو بات پیش آتی اس کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا لیتے اور بعد زمانۂ نبوتؐ زمانہ خلافت میں جو پیش آتی اس کے لیے احکام کی تلاش قرآن وحدیث میں کرتے۔ یہ طریقہ مسلمانوں میں بہت عرصہ تک جاری رہا۔ مگر ہم آسانی کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ تیس۳۰ سال تک ایسا ہوتا رہا جو زمانہ خلافتِ راشدہ کا ہے۔

اب ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جملہ آبادی میں یعنی ابتدا سے آج تک جتنے طبقے بھی ہوئے ہیں۔ ان میں بحیثیت دین اور بحیثیت دنیا اور بحیثیت اعلیٰ اخلاق اور بحیثیت جاہ وحشمت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بحیثیت منظوری اور مقبولیتِ خدا کے کون طبقہ ممتاز رہا ہے؟

اس کا جواب بھی ایک اور صرف ایک ہی ہے کہ وہ طبقہ سب سے اعلیٰ اور افضل تھا جو نبوت کی گود میں تربیت پاکر دوسروں کا رہنما بنا رضی اللہ عنہم۔ پس اب مطلع بالکل صاف ہے، کہ جو طریقہ

اور برتاؤ ان لوگوں کا تھا بس وہی دینِ الٰہی اور منظورِ مصطفائی تھا۔ دگر ہیچ۔

طبقۂ اولیٰ میں فرقہ بندی نہیں تھی

اب سوال یہ ہے کہ اس طبقہ میں فرقہ بندیاں تھیں؟ کیا کوئی شیعہ تھا؟ کوئی حنفی تھا؟ شافعی کہلاتا تھا؟ مالکی تھا؟ یا حنبلی تھا؟ اس کا جواب ان بزرگوں کی تاریخِ ولادت سے مل سکتا ہے جن کی طرف یہ فرقے منسوب ہیں۔ سب سے بڑی عمر کے امام ان میں ابو حنیفہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کے پندرہ سال بعد امام مالکؒ پیدا ہوئے۔ ان کے بعد امام احمدؒ اور امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔ گو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی پیدائش پہلی صدی ہجری میں ہے، مگر بہ حیثیت ایک عالم، مفتی اور مجتہد کے وہ دوسری صدی میں دنیا کے سامنے آتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبقۂ اولیٰ (زمانۂ صحابہؓ) میں ان چاروں فرقوں کا نام نہ تھا۔ کیوں کہ جن اماموں کی طرف ان فرقوں کی نسبت ہے وہی نہ تھے تو فرقہ کہاں؟ پس ان فرقوں کی بابت اس سوال کا جواب اسلامی تاریخ یہی دیتی ہے کہ طبقۂ اولیٰ میں صرف سیدھے سادے مسلمان تھے جن کا دستور العمل قرآن اور اقوالِ

نبی علیہ السلام تھا اور بس۔ اس کے سوا اور کوئی فرقہ نہ تھا۔ نہ فرقہ بندی۔

اب ہم آجکل کی فرقہ بندیوں کی ذرا کیفیت سنا کر فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ سب سے بڑا شگاف جو اسلام کے قلعے میں سب سے پہلے آیا وہ "شیعہ سُنی" کا اختلاف تھا۔ اس شگاف کی بنا صرف یہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ:

"خلافتِ اول حضرت علیؓ کا حق تھا اور وراثت حضرت فاطمہؓ کا"

"سُنی" اس سے منکر ہیں۔

چونکہ ہمارے مضمون کا روئے سخن تاریخی پہلو سے ہے، اس لیے ہم اس میں مذہبی دلائل سے بحث کرنا نہیں چاہتے/ صرف تاریخی پہلو سے اتنا پوچھتے ہیں کہ طبقۂ اولیٰ میں جو اسلام اور اہلِ اسلام کا اعلیٰ نمونہ تھا یہ اختلاف تھا؟ یا اس اختلاف کا کوئی اثر تھا؟ "تاریخ جواب دیتی ہے کہ کوئی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے، سب نے اطاعت کی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے سب نے اطاعت کی حضرتِ عثمانؓ خلیفہ ہوئے، سب نے اطاعت کی، حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو وہ بھی خلیفہ برحق مانے گئے۔

بہرحال اس اختلاف کا اثر ہم اس زمانہ میں کچھ نہیں دیکھتے گو پہلے حضرت علیؓ خلیفہ نہ تھے تاہم خلافت کے کاموں میں برابر

دخیل تھے۔ بابِ عالی کے رکن تھے، عہدہ دار تھے، مشیرِ کار تھے خلافت سے جو خدمت سپرد ہوتی تھی بجا لاتے تھے۔ غرض جہاں تک ظاہری علامات رہنما ہو سکتی ہیں۔ ہمیں ان کے اعمال و اطوار میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

علیٰ ہٰذا القیاس تقسیمِ وراثت کا مسئلہ بھی اس طبقے میں ہم کو کسی طرح باعثِ تفریق معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی اس کا تذکرہ بھی نہیں کرتا تھا۔ جب اس پاک زمانہ میں اس کا کوئی اثر نہ تھا تو اب اس کو ایسا بنا کر تفریق کرنے والا فرقہ بندی کے الزام سے کیوں ملزم نہ ہو گا۔

فرقہ بندیوں نے اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا

اس فیصلہ کے بعد اب ہم دیگر فرقہ بندیوں پر توجہ کرتے ہیں جس نے اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اسلامی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فرقوں کی بڑی لائنیں دو ہیں۔ جن کو شیعہ سُنّی کے اختلاف نے پیدا کیا ہے۔ پھر ان لائنوں میں برانچ لائنیں بھی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے جو فریق موردِ الزام ہو گا ہمیں اس کے ملزم بنانے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ ان فرقوں سے مراد حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی

مذہب ہیں جن کو رجسٹرڈ بتانے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کعبہ شریف کے ارد گرد بھی چار مُصلّے ہیں۔ اس لیے اس اختلاف میں فیصلہ کرنے کے لیے ان مذاہب کی تعریف اور وجہ تفریق بیان کرنا ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان مذاہب کے اصل الاصول وہی ہیں جو زمانۂ صحابہ میں تھے۔ یعنی یہ چاروں مذاہب قرآن و حدیث کو دستورالعمل جانتے ہیں۔ بحمداللہ اس میں کوئی اختلاف نہیں مگر ایک بات ایسی پیدا ہوگئی ہے جس سے یہ سارا اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ جو کچھ ہمارے امام نے جس کے مقلد ہیں سمجھا اور کسی مسئلہ کے متعلق حکم دیا ہے، بس ہمارے لیے وہی کافی ہے، نہ ہم اپنی سمجھ کو دخل دیں اور نہ کسی دوسرے امام کی سنیں۔ دوسرا بھی یہی کہتا ہے اور تیسرا بھی یہی۔ علی ہذا القیاس چوتھا بھی یہی۔

اختلاف کو بھی ہم مذہبی دلائل سے چھونا نہیں چاہتے، کیونکہ

ـہ زمانہ نبوت کے آٹھ سو برس بعد جب چاروں مذاہب والوں میں امامت ور اقتدار کے بارہ میں زیادہ اختلاف اور جھگڑے واقع ہونے لگے، تو فع فساد کے لیے حاکم وقت نے نویں صدی ہجری میں الگ الگ چار صلے بنا دیے، پس ان مصلوں کی حقیقت یہ ہے۔

مذہبی دلائل میں طول ہو جاتا ہے، بلکہ تاریخی شہادت سے صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ طبقۂ اولی میں یہ طریق تھا؟ کسی خاص شخص کو یہ منصب تھا کہ باقی اس کے فہم اور رائے کے آگے سر جھکائیں۔ جہاں تک اسلامی تاریخ شہادت دیتی ہے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ اگر یہ منصب کسی کو ہوتا تو خلیفۂ وقت کو ہوتا حالانکہ اس کو بھی نہ تھا، بعض وقت ایک بڑھیا عورت بھی خلیفہ کے حکم کو رد کر دیتی تھی، جس کے جواب میں خلیفہ کو ماننا پڑتا تھا کہ یہ عورت سچ کہتی ہے مولانا حالی مرحوم نے اسی حکم کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

غلاموں سے ہو جاتے تھے بند آقا،
خلیفوں سے لڑتی تھی اک ایک بڑھیا

جب اس زمانہ میں یہ بندش نہ ہوئی کہ کسی ایک رائے اور فہم کے باقی لوگ پابند ہو جائیں تو پیچھے کیوں ایسا کیا جائے جس سے تفرقہ پیدا ہو۔ ہاں اختلافِ فہم چونکہ قدرتی ہے، اس لیے عالم کو کسی امام سے اتفاق رائے ہو جائے تو بیشک وہ اس سے اتفاق رائے کا اظہار کرے مگر ایسے طور سے کہ فرقہ بندی تک نوبت نہ پہنچے۔

ہماری اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں جو فرقہ بندیاں ہو رہی ہیں طبقۂ اولی یعنی سلف صالحین کی روش چھوڑنے سے ہوئی ہیں ورنہ اگر مسلمان اب بھی اس بات

پر متفق ہو جائیں کہ طبقۂ اُولیٰ کی طرح اپنا دستور العمل قرآن وحدیث کو بنالیں، نہ کوئی نئی روش نکالیں نہ کسی کی طرف اپنی نسبت جدید پیدا کریں تو فرقہ بندیاں دور ہو سکتی ہیں۔

قابلِ غور بات

فرقہ بندی کسی اصولی اختلاف سے ہوتی ہے۔ اگر اصول ایک ہے اور باوجود وحدت اصولی کے صرف فہم کا اختلاف ہے تو فرقہ بندی نہیں ہے، ورنہ اس طرح تو ہر ایک مذہب کے علماء میں اختلاف رائے موجود ہے۔ مثلاً علمائے حنفیہ موجودہ اور سابقہ متقدمین اور متاخرین بلکہ معاصرین وغیرہ سب میں اختلاف نظر آتا ہے تو کیا یہ مختلف فرقے ہیں؟ کیا کوئی کہے گا کہ امام ابوحنیفہ صاحبؒ کا مذہب اور تھا اور شاگردوں کا اور۔ یا موجودہ علمائے حنفیہ میں علمائے دیوبند کا مذہب اور ہے اور علمائے بریلی، بدایوں وغیرہ کا اور؟ نہیں بلکہ سب کے سب حنفی ہیں حالانکہ اختلاف موجود ہے۔

پس کسی جماعت کو دوسری جماعت سے فرقہ کی حیثیت سے الگ سمجھنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان میں اصولی اختلاف ہو۔ پس جس فرقہ کے اصول طبقۂ اُولیٰ کے اصولِ مذہبی سے

ملتے جلتے بلکہ وہی ہوں گے تو وہ فرقہ جدید اور فرقہ بند نہ کہا جائے گا اور جس فرقہ کے اصول جدید ہوں گے وہی فرقہ جدید اور فرقہ بندی کے الزام سے ملزم ہو گا۔

اب ہمارے سامنے چاروں مذاہب حنفی، شافعی، حنبلی، اور مالکی موجود ہیں۔ ان سب کا اصول ہے کہ قرآن و حدیث پر بغیر توسطِ امام مجتہد کے عمل کرنا جائز نہیں اس لیے یہ فرقے اپنے اپنے اماموں کے مقلّد کہلاتے ہیں۔ برخلاف اس کے اہلِ حدیث اس بات کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ شرط طبقۂ اُولیٰ میں نہ تھی ہم طبقۂ اُولیٰ کی روشنی سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹیں گے۔

ع ـــــ جملہ عالم اک طرف آں شوخِ رعنا اک طرف

ایک اعتراض کا دفعیہ

اب ایک سوال یہ ہے کہ دوسرے فرقوں کی طرح ـــــ اہلحدیث بھی تو ایک فرقہ ہے۔ اس سے بھی تو فرقہ بندی پیدا ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ حدیث بحیثیت نام کے ایک فرقہ کہا جائے تو اور بات ہے مگر اصول اور عمل کی

حیثیت سے یہ کوئی فرقہ بندی نہیں بلکہ وہی ایک گروہ ہے جو تعلیم نبوت سے پیدا ہوا تھا جس کی روش ہم بتلا آئے ہیں کہ قرآن و حدیث پر عمل کرنے کی تھی، نہ اس فرقے نے اپنے دستور العمل میں کوئی اضافہ کیا۔ نہ سلف صالحین کی روش سے علیحدگی کی بلکہ بعینہٖ اسی طرح قرآن و حدیث یا یوں کہیے کہ قرآن اور طریقۂ نبی علیہ السلام کو صحابہ کی روش پر محفوظ رکھا۔

رہا نام کا سوال کہ اہل حدیث نام کیوں رکھا گیا جب کہ طبقۂ اُولیٰ نے یہ نام اپنا نہ رکھا۔

تو اس کا جواب بہت آسان ہے کہ اہل حدیث کی اصلیت بتلانے کو عملی طریق کا یہ نام ہے، دوسرے فرقوں نے اپنی نسبت اپنے اماموں کی طرف کر کے حنفی اور شافعی وغیرہ القاب اختیار کیے۔ چونکہ اس فرقہ کی نسبت کسی غیر کی طرف نہ تھی بلکہ طبقۂ اولیٰ کی طرح صرف نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف تھی اس لیے اس نے اپنے طریق عمل کے مطابق اپنا لقب ——— اہلحدیث رکھا جو اس کے طریق عمل کے لحاظ سے بہت موزوں ہے ورنہ اس کا اصول دین جو بنیاد مذہب ہے وہی ہے جو طبقہ اولیٰ کے مسلمانوں کا تھا۔ یعنی قرآن و حدیث بطریق سلف صالحین۔

اهلِ حدیث لقب کے یہ معنی ہیں کہ:

"احادیثِ رسول ؐ پر عمل کرنے والے"

یہی معنی ہیں ——— ع

"کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہے ہیں ہم"

تمہارے پاس 50 روپے ہیں
کل واپس مل جائیں گے
میں مومنہ کو کل سے کہ
وہ آ کے واپس کر دے
دیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصلِ دیں آمد کلام اللہ معظّم داشتن
پس حدیثِ مصطفےٰ بر جاں مسلّم داشتن

اہلحدیث کا مذہب

از افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری

ناشر

ادارہ اشاعۃ السنۃ

جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان حدیث منزل لیک روڈ لاہور